Regd. L. No. 7243

Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مئی 1974

اِس پرچہ میں

اقبالؔ کا مردِ مومن

پرویز

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵ بی ۔ گلبرگ ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ [illegible]

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون	بدل اشتراک
(۱ ½) ڈیڑھ روپیہ	۸۰۸۰۰ خط وکتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور	پاکستان سالانہ ۱۵ روپے غیرممالک سالانہ ½ ۱ پونڈ
نمبر ۵	مئی ۱۹۷۴ء	جلد ۲۷

فہرست

(۱) لمعات ۲
(۲) اقبالؒ کا مردِ مومن ۔ محترم پرویز صاحب کا خطاب ۹
(۳) حقائق وعبر ۳۳
(۴) طلوعِ اسلام کالج فنڈ ۴۰
(۵) اسلامی سربراہی کانفرنس .. (شاہد عادل) .. ۴۱
(۶) باب المراسلات ۵۱
(۷) تعلیمی اداروں سے عربی (محمد شاہد) ۵۵
(۸) مجلسِ مذاکرہ (۱) (منعقدہ طلوعِ اسلام کنونشن نومبر ۷۳ء) ۵۷

ایڈیٹر۔ محمد خلیل • ناشر۔ سراج الحق • مقامِ اشاعت۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور • پرنٹر۔ محمد محسن • لاہور آرٹ پریس انارکلی لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ

سفینہ جبکہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے

ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ اب جبکہ ۱۹۷۱ء کے حادثۂ کبریٰ کے عواقب سے متعلق معاملات، خواہی نخواہی، یکسو ہوگئے ہیں، تو ان کے متعلق مزید گفتگو بیکار ہے۔ یہ کچھ کیوں ہوا، کیسے ہوا، کون کون اس کا ذمہ دار ہے اور کس حد تک، اب یہ تمام امور آنے والے مؤرخ کے لئے چھوڑ دینے چاہئیں۔ ہمیں اب اپنی توجہات اس سوال پر مرکوز کر دینی چاہئیں کہ اس باقیماندہ پاکستان کے تحفظ، بقا، استحکام اور فروغ کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اب بقیہ حصۂ مملکت کے اندرونی احوال و کوائف بھی اس مسئلہ سے کم پریشان کن نہیں جس نے دو سال تک ہمیں وقفِ اضطراب رکھا۔ اس سے کم، تو ایک طرف، یہاں کے حالات اس سے بھی زیادہ مخدوش ہیں اور ہمیں خطرہ ہے کہ اگر انہیں فوراً سنبھالا نہ گیا تو اس کے نتائج بھی کچھ کم تباہ کن نہیں ہونگے۔ اس سلسلہ میں ہم شروع ہی میں واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ نہ تو وہ حالات ہی نئے ہیں جن کا ہم تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور نہ ہی وہ تدابیر نئی، جنہیں ہم پیش کرنا چاہتے، انہیں ہم بارہا بار پیش کر چکے ہیں، لیکن بایں ہمہ، ان کا دُہرانا اسی طرح ضروری ہے جس طرح دوائی کو وقفوں کے بعد (REPEAT) کرنا ضروری ہوتا ہے۔

(۲) اس سلسلہ میں ہم سب سے پہلے اس حقیقت کو سامنے لانا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں ہم ابھی تک ایک قوم نہیں بن سکے۔ ہم نے تحریکِ پاکستان کے دوران، اسلام کے اس بنیادی اصول کو اُجاگر کیا تھا کہ کسی مُلک یا مملکت کے اندر بسنے والے تمام لوگ، وطن کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم نہیں قرار پا سکتے۔ اس میں بسنے والے مسلمان (بلکہ منتہاکے طور پر، ساری دنیا کے مسلمان) دین کے اشتراک کی بنا پر، ایک الگ قوم ہوتے ہیں۔ اور غیر مسلم جُداگانہ قوم۔ اسے "دو قومی نظریہ" کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کی بنیادوں پر ہم نے مملکت پاکستان حاصل کی۔ لیکن یہاں آنے کے بعد ہم نے اپنے اس بنیادی دعوے کو خیرباد کہہ دیا اور اس ملک میں بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں۔ سب کو، ایک قوم تسلیم کر لیا ــــ چلئے، یونہی سہی۔ اسلام نہیں تو کفر ہی سہی، لیکن ستم ظریفی یہ کہ ہم نے کفر کا راستہ بھی "کافرانہ انداز" سے اختیار نہ کیا "منافقانہ انداز"

سے اختیار کیا۔ ہم نے عملاً۔ حتیٰ کہ آئین کی رو سے بھی، یہاں کے مسلموں اور غیر مسلموں کو ایک قوم تسلیم کیا۔ لیکن زبان سے "دو قومی نظریہ" کے الفاظ دُہراتے رہے، اور دُہراتے چلے جا رہے ہیں۔ اس دو رُخی پالیسی کا نفسیاتی نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں معلوم ہی نہیں کہ ہماری قومیت کی اساس کیا ہے! اگر یہ اساس دو قومی نظریہ ہے تو پھر مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ملا کر ایک قوم قرار دینے کا مطلب کیا ہے۔ اور اگر ہماری قومیت کی اساس، وطن کا اشتراک ہے تو پھر "دو قومی نظریہ" کے الفاظ کی تکرار و اصرار کے کیا معنی ہیں؟ اور ظاہر ہے کہ جب کسی قوم کو اپنی قومیت کی اساس یا وجہ جامعیت ہی یقینی طور پر معلوم نہ ہو تو وہ ایک قوم بن ہی نہیں سکتی، افراد کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے۔ ہماری یہی کیفیت ہے۔ ہم میں سے ہر شخص، یا تو انفرادی نقطۂ نگاہ سے سوچتا ہے ــــ معاملۂ زیرِ نظر میں میرا کتنا فائدہ ہے؟ مجھے کیا ملے گا؟ ــــ اور یا گروہ بندانہ زاویۂ نگاہ سے ــــ اس سے میری پارٹی کو کیا حاصل ہوگا ــــ قوم کے نفع یا نقصان کا خیال کسی کے ذہن میں نہیں ہوتا۔ یہ اس لئے کہ (جیسا کہ ہم اُوپر کہہ چکے ہیں) ہم میں قومیت کا شعور پیدا ہی نہیں ہوا۔ ہمیں اپنی قومیت کی اساس و بنیاد ہی کا علم نہیں۔ ہم ایک قوم بن ہی نہیں سکے۔

یاد رکھئے! جب تک ہم اس دو رُخی پالیسی کو نہیں چھوڑتے، ہم قوم بن نہیں سکتے۔ اس دو رُخی پالیسی کے چھوڑنے کا ایک طریق یہ ہے کہ جہاں کوئی شخص "دو قومی نظریہ" کا دعوےٰ کرے، اس سے کہیئے کہ صاحب! ہمیں بتایئے کہ پاکستان میں وہ کونسی دو قومیں بستی ہیں، جو آپ کے "دو قومی نظریہ" کے دعوے کا ثبوت اور شہادت ہیں! اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ وہ مغالطہ آفرینی سے مجتنب، یا کم از کم محتاط ہو جائیں گے۔

(۳) ہم نے اوپر کہا ہے کہ ہم نے عملاً اشتراکِ وطن کو بنائے قومیت قرار دے کر، پاکستان کے تمام (مسلم اور غیر مسلم) باشندوں کو ایک قوم تسلیم کر رکھا ہے۔ لیکن اس باب میں بھی ہم دیانت دار نہیں دُنیا کی کسی قوم میں آپ یہ نہیں دیکھیں گے کہ وہ اشتراکِ وطن کی بنیادوں پر ایک قوم بنے، اور پھر ایسے رجحانات کی پرورش اور ایسے اقدامات کی حوصلہ افزائی کرے جو علاقائی تعصب اور قومی تفریق کا موجب بنیں۔ لیکن ہمارے ہاں یہ سلسلہ عرصہ سے جاری ہے اور دن بدن بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ہمارے ہاں کے اخبارات، رسائل، ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ میں جو کچھ "علاقائی کلچر" کے نام سے پیش کیا جاتا ہے، وہ ملک کے مختلف حصوں کے، ایک دوسرے سے علیحدہ اور منفرد ہونے کا عملی مظاہرہ نہیں تو اور کیا ہے؟ ہمارے ہاں کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیں کہ یہاں جو لوگ "چار قومیتوں" کا نام لیں انہیں تو پاکستان کے دشمن قرار دیا جائے، اور جو لوگ چار قومیتوں کے وجود، نمود، اور فروغ کے لئے عملی اقدامات کریں، وہ اپنی بیش بہا خدمات کے صلہ میں مستحق حمد و ستائش، اور سزاوارِ انعام و اکرام ٹھہریں! یا للعجب!!

یاد رکھیئے! یہاں علاقائی کلچروں کی آڑ میں جو کچھ کیا جا رہا ہے، وہ پاکستان کے خلاف بہت بڑی سازش ہے، جس سے مقصد اس ملک کے ٹکڑے کر دینا ہے۔ مسلم قومیت کا مدار، وحدتِ ایمان پر ہے!

جس کا مشہود مظہر، وحدتِ اُمت کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ مختلف ممالک یا ایک ہی ملک کے مختلف حصوں میں بسنے والے مسلمانوں کی زبان، تراش خراش، وضع قطع، طرزِ بود و ماند مختلف ہو سکتی ہیں لیکن اگر ان میں سے کوئی چیز بھی اس مُلک یا خطۂ مُلک کے مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کا موجب بن سکتی ہو، تو اسے (مستحسن تو ایک طرف) جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اُمتِ مسلمہ، اُمتِ واحدہ ہے اور اس میں تفریق توحید کے خلاف شرک۔

یاد رکھئے! اگر علاقائی کلچروں کا زہر اسی طرح پھیلایا جاتا رہا۔ تو ہم اسلام کی بنیادوں پر تو ایک طرف، وطن کی بنیادوں پر بھی ایک قوم نہیں بن سکیں گے۔

(۴) "دو قومی نظریہ" کے ساتھ ساتھ یہاں "نظریۂ پاکستان" کے الفاظ بھی برابر اور مسلسل دہرائے جاتے ہیں۔ نظریۂ پاکستان کیا ہے۔ اسے قائداعظم نے ایک مختصر سے فقرہ میں سمٹا دیا تھا جب کہا تھا کہ

> ہماری آزادی اور پابندی کی حدود، قرآن مجید کے غیر متبدل اصول و احکام متعین کرتے ہیں۔ (یہ ہے نظریۂ پاکستان)

اس باب میں بھی ہماری روش بعینہٖ "دو قومی نظریہ" جیسی ہے۔ ہم نے ان الفاظ کو زینتِ دہ اوراقِ آئین تو بنا رکھا ہے لیکن عمل سرتاسر ان کے خلاف ہوتا ہے۔ جہاں تک امورِ مملکت کا تعلق ہے، ہم نے کوئی ایسی اتھارٹی ہی مقرر نہیں کی جو اس امر کا فیصلہ دے سکے کہ حکومت کا کوئی فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق ہے یا نہیں نہ ہی افرادِ قوم کو یہ حق دیا ہے کہ وہ کسی فیصلہ کو اس بنیاد پر چیلنج کر سکیں۔ لہٰذا، آئین میں ان الفاظ سے مقصود، ان کی تلاوت سے "حصولِ ثواب" سے زیادہ کچھ نہیں۔ جہاں تک عمل کا تعلق ہے، اس کے لئے بزرگوں کے مزاروں کو غسل دینا۔ ان کی قبروں پر پھولوں کی چادریں چڑھانا، عرسوں اور ختموں کا انتظام کرنا اور ان میں شریک ہو کر سرو پا حاصل کرنا۔ فوٹو اتروانا، اور پھر ان کی عام اشاعت کرانا، مختلف اسلامی تقاریب پر چراغاں اور سرکاری عمارات کی تزئین و آرائش کرنا، چھٹی کا اعلان کرنا، عید، شب برات وغیرہ پر چینی کا کوٹا زیادہ کر دینا۔ رمضان المبارک میں شراب کی دکانیں بند رکھنے کے احکام نافذ کرنا، یا "احترام" کا اہتمام کرنا۔ عیدین کے لئے رویتِ ہلال کمیٹیاں مقرر کرنا، فریضۂ حج کی ادائیگی کے لئے سہولتیں بہم پہنچانا، قرآن مجید پر عمل کرنے کو نہیں بلکہ اس کی صحیح طباعت کو اسلام کی بہت بڑی خدمت قرار دینا — یہ، اور اس قسم کے دیگر "مبارک و مسعود" اقدامات سے عوام کے مذہبی جذبات کی تسکین کے سامان فراہم کرتے رہنا، کافی سمجھ لیا گیا ہے۔

یہ ہے اربابِ اقتدار کی کیفیت۔ جہاں تک ملک کے "مدعیانِ دینِ متین" کا تعلق ہے، ان میں ایک گروہ کا نظریہ اور مطالبہ یہ ہے کہ یہاں دین کا قیام اُسی صورت میں ممکن ہے کہ زمامِ اقتدار ان کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ علامہ اسلم جیراجپوری مرحوم نے ان کے متعلق بہت پہلے فرمایا تھا کہ "حکومتِ خداوندی تو ان کی سمجھ میں آتی ہے۔ دینِ خداوندی سمجھ میں نہیں آتا"۔ باقی رہے دیگر پیشوایانِ مذہب، تو ان کے مطالبہ کا پیمانہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ:

تم جانو غیر سے جو تمہیں رسم و راہ ہو
ہم کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو!

جنہیں "پوچھ لیا جاتا ہے" وہ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ دین کے سب تقاضے پورے ہو گئے۔ جن کی باری نہیں آتی، وہ "اسلام خطرے میں ہے" کی گھنٹی بجاتے رہتے ہیں۔

یاد رکھئے، جب تک کوئی اتھارٹی مقرر نہیں کی جاتی جو یہ فیصلہ دے سکے کہ حکومت کا فلاں اقدام، احکام خداوندی کے مطابق ہے یا نہیں، اور تمام افرادِ قوم کو، متنازعہ فیہ معاملات میں اس اتھارٹی کی طرف رجوع کرنے کا حق حاصل ہو، اس وقت تک آئین میں اس قسم کی شقیں درج کر دینا بے معنی ہے۔ ہماری موجودہ روش کہ آئین میں اس قسم کی شقیں شامل کر دی جائیں، لیکن عملاً نظامِ حکومت سیکولر ہو، ہمیں تباہ کر کے رکھ دے گی۔ یعنی طور پر، اسلام کو "مملکت کا مذہب" قرار دینا، مذہبی پیشوائیت کے لئے فساد انگیزی اور ہنگامہ خیزی کے مواقع زیادہ سے زیادہ تر پیدا کرتا جائے گا۔ اور سیکولر نظام کا آخری نتیجہ، سوشلزم یا کمیونزم ہوگا۔

(۵) اب معاشی نظام کی طرف آئیے۔ یوں تو "روٹی کا مسئلہ" شروع ہی سے انسانی زندگی کا بنیادی مسئلہ چلا آ رہا ہے لیکن موجودہ دور میں اس نے خاص اہمیت اختیار کر رکھی ہے۔ ہمارے زمانے کو تو کہا ہی "عصرِ معاشیات" جاتا ہے۔ موجودہ حکومت سے پہلے کسی نے سابقہ معاشی نظام میں تبدیلی کی ضرورت نہ سمجھی اگرچہ قائداعظمؒ نے (جولائی ۱۹۴۸ء میں اسٹیٹ بنک آف پاکستان کی عمارت کا افتتاح کرتے وقت) واضح الفاظ میں کہا تھا کہ ہمیں اسلامی اصولوں کی روشنی میں اپنا الگ، نظام وضع اور اختیار کرنا ہوگا۔ موجودہ پارٹی نے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے۔ اپنے منشور میں کہا تھا کہ ہماری معیشت سوشلزم ہوگی اور مذہب اسلام۔ ان کے برسرِ اقتدار آنے پر جب یہ اعتراض کیا گیا کہ سوشلزم اور اسلام تو ایک دوسرے کے نقیض ہیں اس لئے سوشلزم نظامِ معیشت اور اسلام بطور مذہب، دوش بدوش کیسے چل سکیں گے۔ تو اس کے جواب میں اسلامی سوشلزم کی ایک نئی اصطلاح ایجاد کر دی گئی۔ جب اسے قابلِ اعتراض ٹھہرایا گیا تو "مساواتِ محمدی" کا نعرہ لگایا گیا۔ اب اس پارٹی کے بعض ارکان کی طرف سے سائنٹیفک سوشلزم کی آواز بلند ہوئی، تو دوسری طرف سے کہا گیا کہ "اسلام کے اقتصادی نظام کی اساس زکوٰۃ ہے اور اس کا محرک غریب اور پسے ہوئے عوام کے استحصال کے بجائے ان کی امداد کا مقدس جذبہ تھا۔ زکوٰۃ کے نظریہ نے نہ صرف عربوں کی روحانی اور اخلاقی زندگی میں ایک عظیم انقلاب پیدا کیا بلکہ ان کی معاشرتی اور اقتصادی اقدار کو بھی سنوار دیا۔" (نوائے وقت۔ ۲۷ مارچ ۱۹۷۴ء)۔ یہ حضرات اس قسم کی مبہم اصطلاحات

ضمناً۔ خدا کے کسی حکم کے متعلق یہ کہنا کہ اس کا "محرک فلاں جذبہ تھا"، صحیح نہیں۔ محرکات اور جذبات انسانوں کے لئے ہوتے ہیں۔ خدا ان سے بلند و بالا اور منزہ و معرّیٰ ہے۔ اس کے فیصلے (احکام) جذباتی محرکات کے پیدا کردہ نہیں ہوتے۔ خدا کے لئے کسی شے کے محرک ہونے کا تصور ہی باطل ہے۔

استعمال کئے چلے جاتے ہیں لیکن کبھی نہیں بتاتے کہ ان کا متعین مفہوم کیا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ آج تک یہی معلوم نہیں ہو سکا کہ ہمارے ملک کا معاشی نظام ہے کیا۔ اور جو نظام یہاں رائج ہے اس کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ عوام کے لئے (جن میں سابقہ متوسط طبقہ بھی شامل ہے) روٹی کا مسئلہ جس قدر پریشان کن آج بن چکا ہے اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں تھا۔ یہی وہ پریشانی ہے جس کی وجہ سے لوگ اس قابل ہی نہیں رہے کہ وہ روٹی کے مسئلہ کے سوا کسی اور معاملہ کی طرف دھیان تک دے سکیں۔ اس سلسلہ میں اس وقت تک جو اصلاحات نافذ ہوئی ہیں۔ ان کا نتیجہ معاشرہ میں عام انتشار اور تصادمات کے سوا کچھ نہیں برآمد ہوا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ متعین طور پر طے کیا جائے اور واضح طور پر قوم کو بتایا جائے کہ ہمارے ملک کا معاشی نظام کیا ہوگا (اس کے لئے محض ایک اصطلاح پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ اس کی تفاصیل واضح الفاظ میں بتائی جائیں)۔ اور اس کی آخری منزل تک بتدریج پہنچنے کے لئے کیا کیا اقدامات کئے جائیں گے۔

(۶) معاشی نظام سے کہیں زیادہ غیر متعین کیفیت ہمارے آئینی اور قانونی نظام کی ہے۔ یہاں نظامِ جمہوریت کا اس قدر شور مچایا جاتا ہے کہ کوئی اور آواز کان میں ہی نہیں پڑ سکتی۔ نظامِ جمہوریت کے معنی یہ ہیں کہ قوم کے نمائندوں (مجالس آئین و قوانین ساز کے ارکان) کی اکثریت جو فیصلہ بھی کر دے، وہ قولِ فیصل قرار پائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمارے آئین میں یہ شق بھی درج ہے کہ قوم کے نمائندے اپنے اس اختیار کو خدا کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال کریں گے۔ لیکن ان حدود کی وضاحت نہ تو آئین میں کی گئی ہے اور (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) نہ ہی کوئی ایسی اتھارٹی مقرر کی گئی جو ان حدود کی وضاحت کر سکے۔ چنانچہ یہاں عملاً سیکولرازم کا جمہوری نظام رائج ہے۔ اس کا نتیجہ ایسا فکری تصادم ہے جس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ فکری تصادم کا فطری نتیجہ انارکی (لاقانونیت) ہوتا ہے جس کی طرف قوم شعوری یا غیر شعوری طور پر کشاں کشاں جا رہی ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ اگر، اس باب میں، ارباب اقتدار کے ذہن صاف نہیں تو وہ انہیں صاف کریں۔ اور اگر ذہن صاف ہیں تو اپنے اندر جرأت پیدا کر کے یکسوئی کا مسلک اختیار کریں۔ اگر وہ واقعی حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے اپنے اختیارات استعمال کرنا چاہتے ہیں تو وہ ان حدود کی وضاحت کریں اور کوئی ایسی اتھارٹی مقرر کریں جو اس امر کا فیصلہ دے سکا کرے کہ حکومت کے اختیارات ان حدود کے اندر استعمال ہو رہے ہیں یا نہیں۔ اور اگر وہ سمجھتے ہیں کہ ان حدود کی پابندی مشکل ہے تو پھر کھلے بندوں سیکولر نظام رائج کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ نظام اسلام کے بھی خلاف ہوگا اور مملکت پاکستان کی اساس کے بھی خلاف، لیکن جب یہاں عملاً یہی کچھ ہو رہا ہے تو قولاً بھی اس کا اعتراف ہونا چاہیئے۔

یاد رکھئے! آئین میں حدود اللہ کا ذکر، یا تقاریر اور بیانات میں خدا اور رسولؐ کے الفاظ، کچھ وقت کے لئے قوم (یا عوام) کو مطمئن رکھ سکتے ہیں۔ لیکن اگر عمل ان کے خلاف ہو تو اس کا ردّ عمل بڑا شدید ہوتا ہے۔ ملک کو اس قسم کے خطرہ سے بچانے کی بڑی ضرورت ہے۔

(۸) ملک کی سب سے اہم ضرورت وہ ہے جس کی طرف ہم تشکیل پاکستان کے دن سے توجہ مبذول کراتے

چلے آ رہے ہیں یعنی ہماری نئی نسل کی تعلیم کا مسئلہ۔ ہماری مسلسل اور پیہم پکار کو کسی نے درخورِ اعتنا نہ سمجھا، اور نظامِ تعلیم میں کوئی صلاحیت بخش تبدیلی نہ کی۔ اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوا؟ اسے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت نہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ آج ہم میں سے ہر شخص "قوم" کے ہاتھوں نالاں ہے! لیکن آپ نے کبھی سوچا بھی کہ یہ قوم ہے کیا اور آئی کہاں سے ہے؟ یہ قوم مریخ سے نہیں ٹپک پڑی۔ یہ قوم ان نوجوانوں پر مشتمل ہے جو تشکیلِ پاکستان کے وقت ابتدائی مدرسوں میں پڑھتے تھے۔ اور جو کچھ یہ آج بن گئے ہیں وہ اس تعلیم کا نتیجہ ہے جو ہم نے انہیں دی ہے۔ لیکن ہم بڑی دلچسپ مخلوق واقع ہوئے ہیں۔ ہم اس تعلیم کی پیدا کردہ پود کے ہاتھوں نالاں بھی ہیں اور وہی تعلیم اس کے بعد آنے والی پود کو بھی دیئے جا رہے ہیں۔

یاد رکھئے۔ ہم کبھی ایسی قوم پیدا نہیں کر سکیں گے جس پر ہم فخر کر سکیں، جب تک ہم اپنے تعلیمی نظام کو صحیح (قرآنی) خطوط پر منتشکل نہ کریں۔ سکولوں اور کالجوں کو قومیانے (حکومت کی تحویل میں لے لینے) سے آپ ان کے انتظامی ڈھانچے میں تو کوئی تبدیلی کر سکتے ہیں (اگرچہ اس وقت تک اس قومیانے نے بھی مزید ابتری ہی پیدا کی ہے) لیکن آنے والی نسل کے قلب و دماغ میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے۔ نہ ہی آپ اسکولوں یا کالجوں میں اسلامیات کا مضمون رائج کر دینے سے کوئی خوشگوار نتیجہ پیدا کر سکتے ہیں۔ خوشگوار نتیجہ پیدا کرنا تو ایک طرف، طلباء پر اس کا ردِ عمل اس کے برعکس ہوتا ہے۔ وہ سرے سے مذہب ہی سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ اس کے لئے آپ کو پورے کا پورا نصاب اور طریقِ تعلیم بدلنا ہوگا۔

(۹) اور سب سے آخر میں، ہماری وہ ابتدائی 'غلطی' جس کے نتیجہ میں ہم آدھا ملک ہاتھ سے گنوا بیٹھے ہیں اور باقیماندہ ملک میں ہر وقت خوف سے ہراساں رہتے ہیں۔ طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ نومبر ۱۹۷۳ء میں، پرویز صاحب نے ایک بصیرت افروز خطاب پیش کیا تھا جس کا عنوان تھا ——— اعمالنامہ ——— اس میں انہوں نے دوٹوک الفاظ میں ان غلطیوں کی نشاندھی کی تھی جو ہم سے گذشتہ پچیس سال میں سرزد ہوئی ہیں۔ ان میں سرِ فہرست وہ غلطی تھی جس کا ہم اب ذکر کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ باؤنڈری کمیشن نے پاکستان کی حدود کے تعین میں ہمارے ساتھ بڑی زیادتی کی۔ اُس وقت کے حالات کے تحت، ہمیں مجبوراً اس ناقص ملک کو قبول کرنا پڑا۔ لیکن ہماری غلطی یہ تھی کہ ہم اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے اور اس کی موجودہ سرحدوں کی حفاظت ہی اپنا نصب العین قرار دے لیا۔ ہمیں چاہیئے تھا کہ ہم ان سرحدوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ، اس رقبہ زمین کے حصول کو اپنا قومی فریضہ قرار دیتے جس سے ہمیں محروم کر دیا گیا تھا۔

دوسری غلطی ہم نے یہ کی کہ ہم نے ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کو ہندوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ ہم نے جب تحریکِ پاکستان کے دوران یہ مطالبہ کیا تھا کہ ہندوستان میں بسنے والے تمام مسلمان اشتراکِ ایمان کی بناء پر ایک قوم ہیں، تو ہمیں چاہیئے تھا کہ حصولِ پاکستان کے بعد، تبادلۂ آبادی کا مطالبہ[1]

---

[1] قائداعظم نے اس کی طرف اشارہ کیا تھا لیکن اُن کی عمر نے ایفا نہ کیا اور یہ بات وہیں کی وہیں رہ گئی۔

کرتے اور "فی کس رقبہ" کے حساب سے "ان مسلمانوں کے یہاں بسنے کے لئے" ہندوؤں سے مزید علاقہ حاصل کرتے۔ اس کے لئے بھی ہمیں جدوجہد جاری کرنی اور رکھنی چاہیئے تھی۔ ہم نے یہ بھی نہ کیا اور اسی رقبہ پر مطمئن ہو گئے جو ہمیں شروع میں ملا تھا۔

ان غلطیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم ایک خول کے اندر سمٹ کر رہ گئے اور اپنی سرحدوں کی حفاظت سے آگے کوئی نصب العین قوم کے سامنے نہ رکھا۔ قوم نے یہ سمجھ لیا کہ سرحدوں کی حفاظت فوج کا فریضہ ہے۔ اس کے بعد قوم کے سامنے کوئی نصب العین ہی نہ رہا۔ یہ حقیقت ہے کہ جب بھی کوئی قوم اپنے حال پر مطمئن ہو کر بیٹھ جائے۔ اس میں حرکت و حرارت کے جذبات سرد اور رفتہ رفتہ مفلوج ہو جاتے ہیں۔ قوم میں جہد مسلسل کا عمل جاری رکھنے کے لئے اس کی نگاہوں میں وسعت پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اقبالؔ کے الفاظ میں۔

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اُٹھتے
نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو اندازِ آفاقی

ضرورت ہے کہ ہم (۱) اس مطالبہ کو تازہ کریں کہ اصولِ تقسیم کی رو سے جس قدر علاقہ پاکستان کے حصہ میں آتا تھا (اور جس سے ہمیں باؤنڈری کمیشن نے محروم کر دیا تھا) وہ ہمیں ملنا چاہیئے۔ اور (۲) ہندوستان کے مسلمانوں میں سے (جن میں مقبوضہ کشمیر کے مسلمان بھی شامل ہیں) جس قدر نفوس ادھر منتقل ہونا چاہیں، ان کے لئے مناسب رقبہ ہندوستان سے حاصل کر کے انہیں ادھر منتقل کر لیا جائے۔ اس سے ایک طرف ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کو بھی سکھ کا سانس لینا نصیب ہوگا۔ اور دو قومی نظریہ بھی اپنے منطقی نتیجہ تک پہنچ جائے گا۔ اس وقت ہماری قوم کے نوجوانوں میں جو بے راہ روی پائی جاتی ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے سامنے کوئی اجتماعی مقصد نہیں۔ ان کے سامنے یہ نصب العین رکھ دیجئے اور پھر دیکھئے کہ ان کی وہ بے پناہ قوتیں، جو اس وقت فقدانِ مقصد کی وجہ سے نہ صرف ضائع ہو رہی ہیں بلکہ باہمی ٹکراؤ سے انتشار اور فساد پیدا کر رہی ہیں، کس طرح ایک نقطہ پر مرکوز ہو کر آتشیں شیشہ میں سے گزرنے والی سورج کی شعاعوں کی طرح، ملک دشمن قوتوں کو خس و خاشاک کی طرح پھونک کر نہیں رکھ دیتیں۔

یہ ہیں سردست ہمارے پیشِ نظر ملک کے استحکام اور قوم کے فروغ کے لئے چند ایک تجاویز۔ باقی پھر سہی ـــــ مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے۔ لیکن یہ، یا اصلاحِ احوال کی کوئی اور تجویز، اسی صورت میں کارفرما ہو سکتی ہے، جب ملک میں امن و امان ہو اور حکومت مستحکم۔ لہٰذا بہی خواہانِ پاکستان کا اولین فریضہ یہ ہے کہ ملک میں ہنگامے اور فسادات نہ برپا ہونے پائیں۔ نظم و نسقِ حکومت کے استقامت و اغلاط کی پُرامن طریق سے اصلاح کی جائے۔ فتنہ و فساد برپا کر کے نہیں۔ یہ اس مملکت کی بقا کی اولین شرط ہے۔

اے بندۂ مومن! تو کجائی؟ تو کجائی؟

★

اقبالؒ کا مردِ مومن

علامہ اقبالؒ کے یومِ وفات (اپریل ۱۹۷۴ء)
کی تقریب پر پرویز صاحب کا خطاب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اقبالؒ کا مردِ مومن

عزیزانِ گرامی قدر - السلام علیکم و رحمۃ اللہ -

ہم آج ایک ایسی واجب الاحترام ہستی کا یومِ وفات منانے کے لئے جمع ہوئے ہیں جو ملتِ اسلامیہ کا بالعموم اور ہم اہلِ پاکستان کا بالخصوص عظیم محسن ہے - پوری ملت کا اس لئے کہ اس نے خدا کی اس کتاب جلیل کو جسے ہم نے صدیوں سے نقش و نگارِ طاقِ نسیاں بنا کر رکھ چھوڑا تھا اور جس کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہیں رہ گیا تھا ــ کہ از یسینِ او آساں بمیری ــ پھر سے کتاب زندہ کی صورت میں پیش کیا - اور اہل پاکستان کا اس لئے کہ اس نے اس بے مقصد مصروفِ دشت پیمائی اور صحرا نوردی قوم کے سامنے زندگی کا ایک بلند نصب العین رکھا - یعنی ایک ایسی آزاد مملکت کا تصور جس میں اسلام پھر سے ایک عملی نظام کی حیثیت سے کار فرما ہو سکے - علامہ اقبالؒ کے یہ بہت بڑے احسانات ہیں جن سے ہم عہدہ برا نہیں ہو سکتے - ان کے احسانات کا یہی احساس ہے جس کی بنا پر میں ۱۹۳۸ء سے آج تک ان کے زندگی بخش پیغام کی یاد تازہ کرائے چلا آ رہا ہوں - اور یہی آج کے اجتماع سے بھی مقصود ہے ــ "پیغامِ اقبالؒ اور قرآن کریم" میرا مخصوص موضوع ہوتا ہے - اس موضوع کے متنوع گوشے ہیں جنہیں بہ تمام و کمال کسی ایک نشست میں پیش کرنا ناممکن ہے - ایک نشست میں ان میں سے کوئی ایک گوشہ ہی سامنے لایا جا سکتا ہے - میں آج جس گوشہ کو نمایاں کرنا چاہتا ہوں اس کا عنوان ہے - اقبالؒ کا مردِ مومن -

اس موضوع تک پہنچنے کے لئے ایک تمہید ناگزیر ہے ــ ایسے ہی ناگزیر جیسے فصل بونے کے لئے زمین کا ہموار اور نرم کرنا ناگزیر ہوتا ہے کہ "تمہید" کے بنیادی معنی یہی ہیں - اور اقبالؒ تو خود اس دنیا کی زندگی کو مزرعِ آخرت کی تمہید قرار دیتا ہے جب کہتا ہے کہ

زمین خاکِ درِ میخانۂ ما　　　فلک یک گردشِ پیمانۂ ما
حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است　　　جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

اور ہمارے موضوع کی تمہید، یا دیباچہ یہ ہے :-

تمہید

قرآن کریم، داستانِ حیات کو بڑے عجوبانہ لیکن اس کے ساتھ ہی انتہائی حکیمانہ انداز سے بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی، ناقابلِ نمو جامد مادہ (Inorganic matter) میں محوِ خواب تھی کہ پانی کے چھینٹے نے اس کی آنکھ کھول دی۔ یوں پانی اور مٹی کے امتزاج سے اولین جرثومۂ حیات وجود میں آیا۔ یہ جرثومہ جوشِ نمو سے دو حصوں میں بٹ گیا جس سے نر و مادہ کا امتیاز عمل میں آگیا اور ان کے اختلاط سے کاروانِ حیات، شاخ در شاخ مختلف سمتوں میں بڑھتا، پھولتا، پھلتا، رواں دواں پھیلتا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ تا آنکہ وہ کروڑوں سال کی منزلیں طے کرتا اور پہلو بدلتا پیکرِ حیوانی میں نمودار ہوگیا۔ اور جب اس نے ایک ارتقائی جست اور آگے لگائی تو زندگی نے لباسِ بشریت اختیار کرلیا۔ ؎

یورپ کے سائنسدان اپنی صدیوں کی تحقیق و کاوش کے بعد اُس نتیجہ پر پہنچے ہیں جسے قرآن نے چودہ سو سال پہلے ان اشارات میں بیان کردیا تھا۔ لیکن اس کے بعد حکمائے مغرب کے نظریہ اور قرآنی حقائق میں ایسا ناقابلِ مفاہمت اختلاف سامنے آتا ہے جسے کفر اور ایمان کے افتراق سے تعبیر کیا جائے گا۔ مغربی محققین کا نظریہ یہ ہے کہ انسانی اور حیوانی زندگی میں کوئی فرق نہیں۔ بجز اس کے کہ انسانی شعور کی سطح ذرا زیادہ بلند ہے۔ دونوں فطرت کے طبعی قوانین کے تابع زندگی بسر کرتے۔ یعنی کھاتے، پیتے، افزائش نسل کرتے اور بالآخر مر جاتے ہیں۔ موت کے ہاتھوں جس طرح دیگر حیوانات کا خاتمہ ہو جاتا ہے اسی طرح انسانی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، انسانی پیکر، ارتقاء کے سلسلۂ دراز کی آخری کڑی ہے۔ اس کے بعد فنا ہے۔ قرآن کریم اس تصورِ حیات کو کفر۔ یعنی حقیقت سے انکار قرار دیتا ہے۔ جب کہتا ہے کہ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَأْكُلُوْنَ كَمَا تَأْكُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷/۱۲) حقیقت سے انکار کرنے والے (یعنی کفّار) حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ یعنی کھاتے پیتے اور بالآخر مر جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ذرا سوچو تو سہی کہ فطرت کا وہ تخلیقی پروگرام جس کی ابتدا اس قدر معجزانہ انداز سے ہوئی۔ پھر کاروانِ حیات جس انداز سے مختلف وادیوں میں سے گزرا۔ اس نے جس طرح انواع و اقسام کے کروڑوں پیکر اختیار کئے۔ اپنی خاصیتیں بدلیں۔ نوعیتیں تبدیل کیں۔ اس میں ایسے ساحرانہ تغیرات نمودار ہوئے کہ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ عروسِ حیات جو بہ ہزار عشوہ و رعنائی پیکرِ انسانی میں کھڑے مسکرا رہی ہے، وہی ہے جس کا آغاز ایک جرثومہ حیات سے ہوا تھا۔ ذرا سوچو کہ یہ تمام محیر العقول پروگرام۔ یہ حیرت بدوش زندگی۔ یہ سرتاسر طلسماتی منزلیں۔ اس تمام نظام ارتقاء کا ماحصل یہی تھا کہ موت کی ایک ٹھوکر

؎ میں نے اس مقام پر محض اشارات سے کام لیا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی میری کتاب ' ابلیس و آدم' میں ملے گی۔

اس کارگہِ نمود و وجود کو مٹی کے گھروندے کی طرح پامال کر کے رکھ دے؟ سوچو کہ یہ تصور کس قدر بے معنی اور یہ نظریہ کیسا بعید از قیاس ہے! لُعبت خاک ساختن می نسزد خدائے را۔ قرآن نے کہا کہ پیکرِ بشریت سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی نہیں۔ یہ ایک جدید سلسلۂ ارتقاء کی اوّلین کڑی ہے یہاں سے کاروانِ حیات ایک نئی منزل میں داخل ہوتا ہے۔ انسانی زندگی اس کے طبعی جسم ہی سے عبارت نہیں۔ اس میں ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات، نفس یا خودی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس سے پہلے مقصود صرف طبعی جسم کی نشو ونما تھا۔ لیکن اب مطلوب انسانی ذات کی نشو ونما ہے۔ انسانی جسم کی نشو ونما دیگر حیوانات کی طرح طبعی قوانین کی رو سے ہوتی ہے۔ لیکن انسانی ذات کی نشو ونما ان غیر متبدل اقدار کی رُو سے ہوتی ہے۔ جو وحی کے ذریعے ملتی رہی ہیں اور جو اب قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ انسانی جسم کی نشو ونما کیسے ہی لطیف و نفیس انداز سے کیوں نہ ہو وہ انسانی جسم ہی رہتا ہے۔ ارتقاء کی اگلی منزل میں نہیں پہنچتا۔ لیکن جب انسانی ذات کی نشو ونما سے 'انسان' سلسلۂ ارتقاء کی اگلی اور بلند منزل میں پہنچ جاتا ہے پھر موت سے اس کا جسم تو پیوندِ خاک ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی ذات کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے لئے آگے بڑھ جاتی ہے۔ جس انسان میں اس کی ذات کی نشو ونما شروع ہو جائے اُسے قرآن کی اصطلاح میں مومن کہا جاتا ہے۔ دین (یعنی اسلامی نظامِ حیات) کا مقصد انسان کو مومن بنانا ہے۔ قرآن کریم وہ ضابطہ زندگی یا پروگرام عطا کرتا ہے جس کی رو سے ایک انسان 'مردِ مومن' بن سکتا ہے۔ اس پروگرام کی رو سے 'حسنات' وہ اعمال ہیں جن سے انسانی ذات کی نشو ونما اور تعمیر ہوتی ہے۔ اور 'سیئات' وہ کام جن سے اس کی تخریب ہوتی ہے۔ یہی خیر وشر کا نقطۂ امتیاز، اور نیکی اور بدی کا معیار و مقیاس ہے۔

آگے بڑھنے سے پیشتر اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ مغرب کے تصورِ حیات اور قرآنی تصور کا فرق محض نظری (Theoretical) یا سائنسی تحقیق کے نتائج کا فرق نہیں۔ یہ ایسا بنیادی فرق ہے جس سے انسانی زندگی کا ہر شعبہ ۔۔۔ معاشرتی، معاشی، سیاسی، تمدنی وغیرہ اساسی طور پر متاثر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے اُسے کفر اور ایمان کے فرق سے تعبیر کیا ہے۔ مغربی نظریہ کی رو سے انسانی زندگی محض طبعی زندگی ہے۔ جو دیگر حیوانات کی طرح طبعی قوانینِ فطرت کی تابع رہتی ہے۔ اس زندگی میں طبعی قوانین سے ماوراء یا بلند کوئی اور قانون نہیں۔ یہ جو آپ اقوامِ مغرب کے ہاں ہر جگہ "جنگل کا قانون" کارفرما دیکھتے ہیں تو یہ اسی نظریاتی زندگی کا عملی اور فطری نتیجہ ہے۔ اسی کو سیکولرازم یا لادینیت کہا جاتا ہے۔ اور جس جہنم میں آج ساری دنیا ماخوذ ہے۔ وہ اسی نظریہ کے برگ وبار ہیں۔ اقبالؔ کے الفاظ ہیں۔

یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد　　　زیرِ گردوں رسمِ لادینی نہاد
در نگاہش آدمی آب و گل است　　　کاروانِ زندگی بے منزل است

(پس چہ باید کرد ۔ صہ ۵۶)

آپ نے دیکھا کہ سائنس کا ایک غلط نظریہ کس طرح انسانی زندگی کے ہر شعبے کو زیر و زبر کر دیتا ہے۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ قرآن کی رو سے دین اور دنیا میں کوئی مغائرت یا ثنویت نہیں، تو اس سے یہی مراد ہے۔ جب تک انسانی زندگی کے متعلق اقوام مغرب کا زاویہ نگاہ نہیں بدلتا۔ وہاں کے سیاسی، معاشی، معاشرتی نظام میں کوئی صالح تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی۔ اس غلط نظریۂ حیات کے تخریبی نتائج نے جو قیامت برپا کر رکھی ہے اس سے متاثر ہو کر اب یورپ کے مفکر رفتہ رفتہ اس طرف آرہے ہیں کہ انسانی زندگی محض حیوانی زندگی نہیں۔ اس سے آگے کچھ اور ہے۔ اور اب مزید ارتقاء طبعی جسم کا نہیں بلکہ اس کی انسانی مضمرات کا ہوگا۔ روس کا مشہور مفکر اوسپنسکی اپنی مشہور کتاب (In Search Of The Miraculous) میں لکھتا ہے:-

> اب انسانی ارتقاء کا مفہوم ہے۔ ان قویٰ اور ممکنات کا نشوونما پانا جو از خود نشوونما نہیں پا سکتیں۔ یعنی جن میں میکانکی طور پر بالیدگی پیدا نہیں ہوسکتی۔ صرف اس نہج کی نشوونما صرف اس انداز کی بالیدگی انسان کا حقیقی ارتقاء کہلا سکتی ہے۔ اس کے سوا کسی اور چیز کو انسانی ارتقاء نہیں کہا جا سکتا۔

برگساں اس سلسلہ میں لکھتا ہے کہ اب ارتقائی منازل سے مقصود یہ ہے کہ "انسان ان حدود سے آگے بڑھ جائے جو مادی فطرت نے نوع انسان پر عائد کر رکھی ہیں"۔

(Two Sources Of Morality And Religion

اور پروفیسر آرتھر تھامسن اپنی کتاب Gospel Of Evolution) کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتا ہے کہ:

> ہم یہ کہنے کی جرأت کرسکتے ہیں کہ ہکسلے نے یہ غلط کہا تھا کہ کائناتی تجربہ کا اخلاقی تقاضوں سے کچھ تعلق نہیں اس کے برعکس، ہم پروفیسر (Patriok Geedes) سے متفق ہیں کہ فطرت درحقیقت اخلاقی عمل ہی کی مادی شکل کا نام ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ حقیقت، ارتقائی کتاب مقدس کا نہایت اہم جزو ہے۔ حیوانات سے ہمارا تعلق اب ہمیں ملائکہ کی طرف لئے جا رہا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ یہ حضرات اب خالص مادی نظریہ ارتقاء کو باطل قرار دے کر کس طرح انسانی ارتقاء کی طرف آرہے ہیں۔ لیکن چونکہ قرآن کی شمع تابندہ ان کے سامنے نہیں اس لئے مزید ارتقائی منازل کے راستے اور ان کے طے کرنے کا پروگرام، ہنوز نکھر اور ابھر کر ان کے سامنے نہیں آیا۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ بھی ہو جائے گا کہ اس کے سوا انسان کے لئے کوئی چارۂ کار نہیں۔

مستقل اقدار

میں نے پہلے کہا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوتی ہے۔ ان اقدار کی اصل وحقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآن کریم نے ذات خداوندی کا تعارف اس کی صفات کی رو سے کرایا ہے جنہیں الاسماء الحسنیٰ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ان صفات یا اسماء کی رو سے ذات خداوندی

کے مختلف گوشوں کی جھلک سامنے آتی ہے۔ انسانی دنیا میں انہی کو مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ تو ایسی صفات ہیں جو ذاتِ خداوندی سے مختص ہیں۔ مثلاً ھوالاوّل والآخر۔ ھوالظاھر والباطن۔ یعنی اس کا زمان اور مکان کی حدود سے ماورا ہونا۔ یا فاطر السمٰوٰت والارض کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والا۔ اس قسم کی صفات کے سوا، باقی صفات ایسی ہیں جنہیں انسان علیٰ حدِ بشریت، اپنی ذات میں منعکس کر سکتا ہے۔ انہی کو مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ قرآن نے انہیں صِبْغَۃَ اللہ (۲/۱۳۸) یا "اللہ کا رنگ" کہہ کر پکارا ہے۔ جوں جوں انسان ان صفات کو اپنی ذات میں منعکس کئے جاتا ہے۔ اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ قرآن میں بیان کردہ صفاتِ خداوندی پہ نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ ان میں سے بیشتر صفات ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ مثلاً خدا غفور الرحیم بھی ہے اور شدید العقاب بھی۔ وہ عفوٌ کریم بھی ہے اور جبّار و متکبّر بھی۔ ان صفات میں باہمدگر تضاد نہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ مختلف خصوصیات کا مجموعہ ہے۔ جن میں سے ہر خصوصیت (صفت) کا ظہور اس کے مناسب موقعہ پر ہوتا ہے۔ وہ ظالم کے لئے نہایت سخت گیر ہے اور مظلوم کے لئے رحیم و کریم۔ وہ قوانین خداوندی کے سامنے جھکنے والے کو سرفرازی اور سربلندی عطا کرتا ہے۔ اور ان سے سرکشی برتنے والے کی نخوت و تکبر کو توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ سوال ان صفات ہی کا نہیں۔ اس کے ساتھ سوال یہ بھی ہے کہ کس موقعہ پر خدا کی کس صفت کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ بات قرآن کریم کے گہرے مطالعہ سے سمجھ میں آسکتی ہے۔

ہمارے ہاں جب مومنین کی خصوصیات کا ذکر ہوتا ہے تو اس کے لئے عام طور پر چند اخلاقی خوبیاں گن دی جاتی ہیں۔ (مثلاً) وہ جھوٹ نہیں بولتے۔ بد دیانتی نہیں کرتے۔ وغیرہ۔ یہ ٹھیک ہے۔ مومنین ان خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ لیکن جس باب میں مومن دوسرے "نیک لوگوں" سے منفرد ہوتے ہیں۔ وہ اور ہے۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ خارجی دنیا میں ظہور میں آئے تو اُس وقت جس صفت خداوندی کو ظہور میں آنا ہو۔ مومن کی طرف سے اسی صفت کا ظہور ہو۔ یعنی ہر واقعہ پر اس کا ردِعمل وہی ہو جو اس سے خدا کا "ردِعمل" ہو۔ گرفت کے موقع پر گرفت۔ رحم کے موقعہ پر رحم۔ سرسام زدگان کی فصد کھولنے کے لئے نوکِ نشتر اور زخموں کے اندمال کے لئے مرہم کا پھایا۔

اس تمہید سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ قرآن کریم نے ذاتِ خداوندی کی صفات اور مختلف مواقع پر ان کے ظہور کی جو تفاصیل بیان کی ہیں وہ حدودِ بشریت کے اندر درحقیقت مومنین کی خصوصیات کا تذکرہ ہے۔ بالفاظِ دیگر قرآن کریم کی ساری تعلیم کا منتہیٰ و مقصود یہ بتانا ہے کہ ایک انسان کس طرح مومن بنتا ہے اور مومن کی زندگی سے کس کس قسم کی خصوصیات کی نمود ہوتی ہے۔ میں نے "نمود" کا لفظ ارادۃً استعمال کیا ہے۔ بتانا اس سے یہ مقصود ہے کہ ایک مومن (مثلاً) جب عدل کرتا ہے تو وہ محنت و کاوش سے (With Effort) ایسا نہیں کرتا۔ عدل اس کی ذات کی خصوصیت ہے جو مناسب موقعہ پر خود بخود نمودار ہو جاتی ہے، جس طرح روشنی اور حرارت سورج کی ذاتی خصوصیت ہے جس کا انعکاس خود بخود ہوتا رہتا

ہے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ مومن جس وقت سخت گیر ہوتا ہے اس وقت اس میں رحیمی اور کریمی کی صفت موجود نہیں ہوتی۔ مومن کی ذات میں یہ تمام صفات ہر وقت موجود رہتی ہیں اور مناسب مواقع پر خود بخود ظہور میں آتی رہتی ہیں۔ یوں کہئے کہ مومن مختلف صفات کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ اس کی ذات ہمہ گیر ہوتی ہے جس میں یہ تمام صفات یوں سموئی ہوئی ہوتی ہیں جس طرح پھول میں خوشبو، رنگینی، لطافت، نزاکت اور طبی خواص۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے، قرآن مجید درحقیقت مومنین کی اپنی صفات و محاسن کا تذکرہ مجید ہے اس کا ارشاد ہے کہ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۲۱/۱۰) ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب نازل کی ہے جس میں خود تمہارا ذکر ہے۔ اس حقیقت کو عقل و بصیرت کی رو سے سمجھو۔ دیکھئے اس عظیم حقیقت کو اقبال کس حسین انداز میں بیان کرتا ہے جب کہتا ہے کہ

محمدؐ بھی ترا، جبریلؑ بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

اور جس طرح قرآن کریم مختلف طرق و اسالیب سے مومنین کی خصوصیات کبریٰ کا تذکرہ کرتا ہے، اسی طرح اقبال بھی گوناگوں انداز سے مومن کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے۔

یہاں یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ ارتقاء کے اس عظیم نظام سے مقصد افرادِ انسانیہ کی ذات کی نشوونما ہی ہے یا یہ نظامِ کائنات کے خدائی پروگرام میں بھی کوئی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ یہ درحقیقت خدائی پروگرام کی تکمیل کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ وہ ان افراد (مومنین) کو حزب اللہ (۵۸/۲۲) کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی خدا کی پارٹی۔ یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے قرآن نے ان دو لفظوں میں اپنے مخصوص معجزانہ انداز میں بیان کر دیا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ انسانی دنیا میں خدا نے جس قدر ذمہ داریاں اپنے اوپر لے رکھی ہیں، وہ خدا کی اس پارٹی (جماعت مومنین) کے ہاتھوں سرانجام پاتی ہیں۔ مثلاً مدینہ میں اس جماعت کی اپنی مملکت قائم ہوئی، لیکن مکہ میں ابھی ایسے مسلمان تھے جو گھر کر رہ گئے تھے اور مخالفین انہیں طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے۔ یہ لوگ اپنی انتہائی مظلومیت کی حالت میں خدا کو مدد کے لئے پکارتے تھے۔ خدا قادرِ مطلق ہے۔ اس کے لئے کچھ بھی مشکل نہ تھا کہ وہ ان ستم زدگان کی براہِ راست مدد کر کے انہیں وہاں سے نکال لیتا۔ لیکن اس نے خود ایسا نہیں کیا۔ اس نے اپنی پارٹی (یعنی مدینہ کے مسلمانوں) سے کہا کہ:۔

(اے ہماری پارٹی کے لوگو!) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ظالمین مکہ کے خلاف جنگ کے لئے نہیں نکلتے؟ تم سنتے نہیں کہ وہاں کے مظلوم مرد، عورتیں، بچے، کس طرح بلک بلک کر ہمیں پکار رہے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں اس بستی سے جس کے باشندوں نے ظلم پر کمر باندھ رکھی ہے بحفاظت نکال لینے کا سامان پیدا کر دے تو ہمارے لئے کوئی مددگار بھیج۔ تو کسی کو ہمارا پشت و پناہ بنا۔ (۴/۷۵)

آپ نے غور فرمایا کہ وہ لوگ خدا کو مدد کے لئے پکار رہے تھے، اور خدا "حزب اللہ" یعنی اپنی پارٹی

سے کہہ رہا تھا کہ تم سنتے نہیں ہو کہ وہ لوگ ہمیں کس طرح پکار رہے ہیں۔ تم اُن کی مدد کے لئے کیوں نہیں اُٹھتے۔ یہ ان کی مدد کے لئے اُٹھے اور ان کے دشمنوں کو میدانِ جنگ میں فنا کے گھاٹ اُتار دیا۔ اس جنگ کا ذکر کرتے ہوئے خدا نے بعد میں کہا کہ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وہاں ان مخالفین کو تم قتل نہیں کر رہے تھے، ہم قتل کر رہے تھے وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸/۱۷) تم تیر نہیں چلا رہے تھے، ہم چلا رہے تھے۔ اور یہ اس لئے تھا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا (۹/۴۰) کہ مخالفینِ حق و صداقت کے پروگرام کو شکست ہو اور خدا کا پروگرام غالب آئے۔ اور اس کے لئے کہا کہ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ (۴۷/۷) اگر تم خدا کی مدد کے لئے اُٹھو گے تو خدا تمہاری مدد کرے گا، کہ تم درحقیقت خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے مصروفِ تگ و دو ہوتے ہو۔

یہ ہے عزیزانِ من! جماعتِ مومنین کا مقام اور یہ ہے وہ دلکش و بصیرت افروز انداز جس سے خدا ان کا تذکرہ کر رہا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بار بار کہا ہے کہ ان کا پیغام، قرآن کے پیغام ہی کی تشریح و تبئین ہے۔ اس لئے ان کا کلام 'بنیادی طور پر' مردِ مومن کی خصوصیات 'مقام، فریضۂ حیات اور مطمحِ زندگی کا تابندہ و درخشندہ آئینہ ہے۔ آیئے اس آئینہ میں مردِ مومن کی چند ایک جھلکیاں دیکھیں۔

بندۂ مولا صفات

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مومن وہ ہے جس کی ذات میں 'صفاتِ خداوندی علیٰ حدِ بشریت' جھلمل جھلمل کر رہی ہوں اور کائنات کے خدائی پروگرام اس کے ہاتھوں تکمیل تک پہنچیں۔ دیکھئے حضرت علامہ ان حقائق کو اپنی نظم مسجد قرطبہ میں کس وجد آفرین انداز سے بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:۔

ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ　　غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات　　ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی اُمیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل　　اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو　　رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز
نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خدا کا یقیں　　اور یہ عالم تمام، وہم و طلسم و مجاز

عقل کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

آپ اس مصرعہ میں "عقل کی منزل" اور "عشق کا حاصل" کی اصطلاحات پر غور فرمایئے اور پھر قرآن کریم کی اس آیۂ جلیلہ کو سامنے لایئے جس میں کہا گیا ہے کہ

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ۔

وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا...

(۳/۱۸۹-۱۹۰)

یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں ان کے لئے کائنات کی تخلیق اور رات دن کی گردش میں قوانین خداوندی کی حکمیت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ اُن صاحبان علم و بصیرت کے لئے جو زندگی کے ہر گوشے میں، کھڑے، بیٹھے، لیٹے، قوانین خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے اور کائنات کے تخلیقی پروگرام پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور اپنی تحقیقات کے بعد علی وجہ البصیرت پکار اُٹھتے ہیں کہ کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کارگہِ ہستی کو نہ تو بیکار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لئے۔

لہٰذا مردِ مومن، علم و ایقان، فکر و ایمان، عقل و عشق، خبر و نظر کا حسین امتزاج ہوتا ہے جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اس کی ذات متضاد صفات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ جن میں سے ہر صفت اپنے اپنے وقت پر اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اور یوں دنیا اس طلسم کدۂ رنگارنگ (Kaleidoscope) کے مختلف پہلوؤں کو دیکھ کر محوِ حیرت رہ جاتی اور وجد و کیف کے عالم میں بے ساختہ پکار اُٹھتی ہے کہ

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن — گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

اللہ کی برھان

ان ابیات میں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ مومن کے متعلق کہا گیا ہے کہ گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان، تو اس سے کیا مراد ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر مخلوق اپنے خالق کے جوہرِ تخلیق کی زندہ شہادت ہوتی ہے۔ مونا لیزا کے سحر آفریں تبسم کا حذنگِ بے کمان، لیونارڈو کے عظیم فنکار ہونے کی دلیل اور شہادت ہے۔ خدا نے اپنی مخلوق میں سے انسان کے متعلق کہا ہے کہ اُسے احسنِ تقویم میں پیدا کیا گیا ہے، یعنی حسین ترین ہیئت ترکیبی لئے ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اس ہیئت ترکیبی سے مراد انسانی جسم کی رعنائی اور زیبائی نہیں، کیونکہ اس کے بعد ہے ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ۔ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ۔ (۹۵/۵-۶) انسان کے اندر حسین ترین مخلوق ہونے کے ممکنات پوشیدہ ہیں۔ لیکن چونکہ اسے اس امر کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان ممکنات کو جس قالب میں جی چاہے ڈھال لے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے بیباک جذبات کی رو میں بہ کر پست ترین درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔ لیکن جو لوگ اپنی ذات کے ارتقائی مدارج پر یقین رکھتے ہوئے خدا کے تجویز کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں وہ پستی کے گڑھے میں گرنے کے بجائے انسانی ہیئت کے بلند ترین اور حسین ترین مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ انہی کو مومن کہا جاتا ہے۔ لہٰذا مومن کی ہر نقل و حرکت

خدا کے احسن الخالقین ہونے کی شہادت ہوتی ہے۔ اس کے کردار کو دیکھ کر ہر شخص بلاساختہ پکار اٹھتا ہے کہ جس ہستی کا تخلیقی شاہکار ایسا ہے اس کے بے مثل و بے نظیر ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ اس لئے مومن —— گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان بن جاتا ہے۔

تقدیرِ یزداں

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے۔ یہ بھی ایک عظیم حقیقت کا اظہار ہے۔ مطلب اس سے یہ ہے کہ اگر کسی نے یہ معلوم کرنا ہو کہ فلاں معاملہ میں خدا کی مشیّت، اس کا ارادہ کیا ہے۔ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ معلوم کرے کہ اس باب میں مردِ مومن کا فیصلہ اور ارادہ کیا ہے۔ اس موقع پر جو فیصلہ مومن کا ہو، سمجھ لیجئے کہ وہی خدا کی مشیت ہے۔ خدا ایسا ہی کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے کہ مومنین کے متعلق بتایا یہ گیا ہے کہ وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ۔ (۷۶/۳۰) وہ وہی چاہتے ہیں جو خدا چاہتا ہے۔ ان کی مشیت مشیتِ خداوندی کی مظہر ہوتی ہے اور ان کا چاہنا خود خدا کا چاہنا۔ اس حقیقت کو حضرت علامہ نے اپنے اس شعر میں بانداز نو بیان کیا ہے جسے دُہرایا تو اکثر جاتا ہے، لیکن سمجھا بہت کم۔ یعنی

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

خودی کی بلندی کے معنی یہ ہیں کہ انسانی ذات، صفاتِ خداوندی کی آئینہ دار بن جائے۔ جب ایسا ہو جائے تو پھر مومن کا ارادہ وہی ہوتا ہے جو خدا کا ارادہ ہو۔ اس کا فیصلہ وہی ہوتا ہے جو خدا کا فیصلہ ہو۔

چوں فنا اندر رضائے حق شود
بندۂ مومن قضائے حق شود

اس طرح مومن کے ارادے اور فیصلے خدا کے مقاصد کے پہچاننے اور ماپنے کا مقیاس بن جاتے ہیں۔ ہم اُوپر دیکھ چکے ہیں کہ بدر کے میدان میں جماعت مومنین کی مقاتلانہ تگ و تاز کے متعلق خدا نے کہا تھا کہ تم تلواریں نہیں مار رہے تھے، ہم مار رہے تھے۔ تم تیر نہیں چلا رہے تھے، ہم چلا رہے تھے۔ اس طرح خدا کی مرضی تمہارے ہاتھوں سے پوری ہو رہی تھی۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علامہ جاوید نامہ میں کہتے ہیں۔

عزمِ او خلاقِ تقدیرِ حق است
روزِ ہیجا تیرِ او تیرِ حق است

یہ اندازِ گفتگو فلسفیانہ سا ہے۔ اس کو ذرا شوخ انداز میں یوں کہتے ہیں کہ

کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

تقدیر کے ہاتھوں رونے والے مسلمان کو وہ "جھنجھوڑ کر کہتے ہیں کہ

تیرے دریا میں طوفان کیوں نہیں ہے؟ خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

جب مومن اس طرح خود "تقدیرِ یزداں" بن جاتا ہے تو پھر وہ زمانے کی تقدیروں کو بدل دیتا ہے۔ تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیتا ہے۔ اقوامِ عالم کی بساط اُلٹ دیتا ہے۔ رنگ کائنات تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ کچھ بن جاتا ہے۔ مردِ مومن جب وہ اپنے ارادوں کو خدا کے ارادوں کے تابع کر دیتا ہے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یہ ہے مطلب حضرت علامہ کے یہ کہنے کا کہ — قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — یہ تو رہا اس دنیا کا معاملہ۔ اور اگر کوئی یہ دیکھنا چاہے کہ اس کے اعمال اسے جنت کا مستحق بنا دیں گے یا نہیں تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ مومن کے اعمالنامہ کو سامنے رکھ کر دیکھ لے کہ اس کے اعمال اس پیمانے پر پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ اس لئے کہ مومن کی خصوصیت یہ ہے کہ — دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان

عقل و جذبات

اب آگے بڑھئے۔ عقل اور جذبات کو دو متضاد عناصر خیال کیا جاتا ہے۔ جن میں ہمیشہ باہمی کشمکش رہتی ہے اور جب جذبات عقل پر غالب آجاتے ہیں تو انسان تباہ ہو جاتا ہے۔ رہبانیت (یعنی تصوف) میں اس کا علاج یہ بتایا جاتا ہے کہ جذبات کو فنا کر دیا جائے۔ بظاہر یہ بات کچھ ناقابلِ قبول سی نظر آئے گی لیکن یہ حقیقت ہے کہ تصوف کا یہ مسلک خود خالقِ جذبات کا پیدا کردہ ہے۔ جذبات کو اس قدر قابلِ نفرت سمجھنا کہ انہیں فنا کر دینا ہی مقصودِ حیات قرار دے لیا جائے۔ عقل کا فیصلہ قرار نہیں پا سکتا۔ عقل اسے بخوبی جانتی ہے کہ اگر انسان میں جذبات نہ ہوں تو اس کا (عقل کا) کوئی فیصلہ بروئے کار آہی نہ سکے۔ عقل کے فیصلے عملی پیکر اختیار ہی جذبات کی قوت سے کرتے ہیں۔ لہٰذا عقل کا کیسے یہ تقاضا ہو سکتا ہے کہ وہ ایسے کار آمد عنصر کو اپنے ہاتھوں فنا کر کے خود بھی معطل بن کر رہ جائے! ترکِ جذبات کے معنی ہیں ترکِ آرزو، ترکِ مقاصد۔ اور یہ خالص جذباتی تعبیر ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور حقیقت بھی قابلِ غور ہے۔ انسانی جذبات بھی اسی خدا کے پیدا کردہ ہیں جس خدا نے انسان کو عقل عطا کی ہے۔ لہٰذا خدا کی پیدا کردہ اتنی بڑی خصوصیت اور صلاحیت کو شجرِ فلہٰذا قابلِ نفرت اور لائقِ ترک قرار دینا خدا کے عظیم تخلیقی پروگرام کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ خدا سے جنگ کرنا خدا کے مقربین کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ اور آخری بات یہ کہ جب جذبات ایسی قوت نہیں جسے آپ فنا کر سکیں۔

اُنہیں آپ وقتی طور پر دبا تو سکتے ہیں، فنا نہیں کر سکتے۔ اور دبانے کی صورت میں بھی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ آپ ان کا ایک راستہ بند کرتے ہیں تو وہ اپنے لئے دس اور راستے تراش لیتے ہیں۔ نفسیات کی اصطلاح میں اسے بدنہادی یا (Perversion) کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے جذبات کو قابلِ نفرت، فلہٰذا فنا کر دینے کے لائق قرار نہیں دیا۔ وہ انہیں بڑی اہمیت دیتا ہے اور ان کا اسی طرح احترام کرتا ہے جس طرح عقل کا۔ لیکن وہ کہتا یہ ہے کہ انسانی جذبات کو سرکش اور بیباک نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ انہیں ہمیشہ۔ ہدایت۔ یعنی اقدارِ خداوندی ۔۔۔ کے تابع رکھنا چاہیئے۔ جب جذبات، آسمانی ہدایت کے تابع رہیں گے تو اُن کا نتیجہ تعمیر ہی تعمیر ہوگا۔ لیکن جب یہ اس سے سرکشی اختیار کر جائیں گے تو اس سے تباہی، بربادی، تخریب اور فساد پیدا ہوگا۔ اس کا ارشاد ہے کہ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (۲۸/۵۰) "اس سے زیادہ راہ گم کردہ کون ہو سکتا ہے جو ہدایتِ خداوندی سے بے نیاز ہو کر اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے"۔ مؤمن میں عقل اور جذبات دونوں اپنی انتہائی شکل میں موجود ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ان دونوں کو ہدایتِ خداوندی کے تابع رکھتا ہے۔ اس پس منظر میں اس نظم کو سامنے لائیے جو ضربِ کلیم میں مدنیتِ اسلام کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے؟ یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں

نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں

حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطوں

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال

عجم کا حسنِ طبیعت، عرب کا سوزِ دروں

اس سرتاپا مرصع نظم کا ایک ایک شعر قرآن کی روشنی میں توضیح و تشریح کا متقاضی ہے لیکن نقطۂ زیرِ نظر کی رعایت سے ہم سردست اس کے مطلع تک محدود رہتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ مومن کی زندگی ۔۔۔ یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں ۔۔۔ یعنی عقل جو اپنے انتہائے کمال تک پہنچی ہوئی ہو، اور جذبات کی ایسی شدت جو سطح بیں لوگوں کی نگاہ میں دیوانگی نظر آئے۔ قرآن کریم نے عقل و جذبات کے اسی امتزاج کو چند الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (۳/۱۵۸) اے رسولؐ! تم مہماتِ امور میں اپنے رفقاء سے مشورہ کیا کرو۔ اس کے بعد جب تم فیصلہ پر پہنچ جاؤ اور اپنے پروگرام کو بروئے کار لانے کا عزم کر لو، تو پھر قوانینِ خداوندی کی محکمیت پر یقینِ کامل رکھ کر میدان میں نکل آؤ۔ اور تمام خطرات سے بیگانہ ہو کر جانبِ منزل بڑھتے چلے جاؤ۔ یقیناً فتح و نصرت تمہارے قدم چومے گی۔

ظاہر ہے کہ "مشورہ" نہایتِ اندیشہ، کمالِ عقل و فکر کا نام ہے جس میں جذبات کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اگر مشورہ میں جذبات دخل انداز ہو جائیں تو انسان کبھی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا وحیِ خداوندی کی روشنی میں عقل و بصیرت کی رو سے، پیشِ نظر معاملہ کا باہمی مشاورت سے فیصلہ کرو۔ اب اگلا قدم اس

فیصلہ کو بروئے کار لانا ہے۔ اس کے لئے پہلی شرط عزم راسخ ہے۔ اور دوسری چیز اپنے فیصلہ کے مبنی برحق ہونے پر یقین کامل۔ ان کا تعلق جذبات سے ہے۔ اُن مومنانہ جذبات سے جن کے حاملین کے متعلق کہا کہ اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ ۔ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ ۔ (۳/۱۷۲) وہ لوگ کہ جب ان سے دوسروں نے کہا کہ تمہارے مخالفین نے ہمارے خلاف ایک لشکر جرار جمع کر رکھا ہے۔ اس لئے اُن سے ڈرو اور آگے نہ بڑھو۔ تو اس سے، بجائے اس کے کہ وہ خائف ہوں، ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے کہا کہ ہمیں ان کی پرواہ کیا ہے۔ ہمارا بھروسہ قوانین خداوندی کی محکمیت پر ہے اور یہ اتنی بڑی قوت ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی ــــ یہ ہے مردانِ مومن کا عزم و توکل جس کی رو سے وہ دیوانہ وار، آتش نمرود میں کود جاتے اور مخالفت کی ہر قوت پر غالب آجاتے ہیں۔ دیکھئے اقبال اس حقیقت کو کیسے بصیرت افروز انداز میں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

اُمتاں را زندگی جذب درون کم نظر ایں جذب را گوید جنون
ہیچ قومے زیر چرخ لاجورد بے جنونِ ذو فنوں کارے نکرد

مومن از عزم و توکل قاہر است
گر ندارد ایں دو جوہر کافر است

لیکن جذبات کی اس قدر اہمیت کے باوجود مومن کی زندگی میں یہ کس طرح اقدار خداوندی کے تابع رہتے ہیں، اسے قرآن کریم نے ایک آیت میں نہایت جامعیت سے واضح کر دیا ہے۔ جہاں کہا ہے کہ قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَ اَبْنَآؤُکُمْ وَ اِخْوَانُکُمْ وَ اَزْوَاجُکُمْ وَ عَشِیْرَتُکُمْ ۔ اے رسولؐ! ان سے کہدو کہ اگر تمہارے ماں باپ، بیٹے بیٹیاں، بھائی برادر، تمہاری بیویاں یا دیگر رشتہ دار، وَ اَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْھَا ۔ تمہارا مال و دولت جسے تم نے محنت شاقہ سے حاصل کیا ہے۔ وَ تِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا تمہارا کاروبار جس کے مندا پڑ جانے سے تم خائف رہتے ہو۔ وَ مَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَآ اور تمہارے یہ محلات جنہیں تم اس قدر پسند کرتے ہو۔ غرضیکہ دنیا کی کوئی کشش و جاذبیت۔ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ وَ جِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ ۔ تمہارے نزدیک خدا، رسولؐ اور اس کے راستے میں جہاد سے زیادہ محبوب ہو جائیں۔ فَتَرَبَّصُوْا ۔ تو انتظار کرو حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ ۔ (۹/۲۴) تاآنکہ قانونِ خداوندی اپنا فیصلہ صادر کر دے اور تم تباہ و برباد ہو جاؤ ــــ یہ ہے قرآن کی رو سے، اقدار خداوندی سے ٹکراؤ کی صورت میں انسانی جذبات کی حیثیت۔ اس قسم کے تصادم کے وقت مومن جذبات کا دامن جھٹک کر، اقدار خداوندی کے تحفظ کے لئے دیوانہ وار آگے بڑھ جاتا ہے۔ اسے پھر دُہرا دیا جائے کہ مومن تمام معاملات کے فیصلے ہدایت خداوندی کی روشنی میں عقل و فکر اور غور و تدبر کی رو سے کرتا ہے۔ اور جب کسی معاملہ میں فیصلہ کر کے اسے بروئے کار لانے کا عزم کر لیتا ہے۔ تو پھر وقتی مصلحت کوشیوں سے بے نیاز ہو کر راستے کی تمام مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اقبالؒ نے اس حقیقت کو دو لفظوں میں سمٹا دیا ہے۔ جب کہا ہے کہ

فرزانہ بگفتارم دیوانہ بکردارم

لیکن یہی جذبات جب اس کی راہ کے کانٹے بنتے نظر آئیں تو وہ یہ کہتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے کہ

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں - لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ

عملِ تخلیق

اب ایک اور گوشے کی طرف آئیے۔ خدا کی ایک صفت 'فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ' ہے۔ یعنی کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والا۔ یہ صفت خدا کے لئے مختص ہے اور انسانی ذات، خواہ وہ کتنی ہی نشو و نما یافتہ کیوں نہ ہو جائے۔ اس صفت میں شریک نہیں ہو سکتی۔

حیوانی سطح پر افزائش نسل کا ذریعہ تولید ہے۔ یعنی جنسی اختلاط۔ خدا اس سے بلند و برتر ہے۔ اسی لئے اس نے اپنے متعلق کہا ہے کہ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ (۱۱۲/۳)۔ اس کی ذات افزائش کے طریق تولید سے بلند و بالاتر ہے۔ لیکن انسانی نسل کی افزائش' طریق تولید کی رو سے ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے حیوان اور انسان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

لیکن پیدائش کا ایک اور طریق ہے جسے عملِ تخلیق کہا جاتا ہے۔ تخلیق کا عمومی مفہوم یہ ہے کہ جو عناصر موجود ہوں انہیں مختلف تراکیب سے امتزاج کے ذریعے نئی نئی چیزیں پیدا کرنا۔ خدا نے اپنے آپ کو اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ کہا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے علاوہ اور خالق بھی ہو سکتے ہیں، اگرچہ ان کا عملِ تخلیق' خدا کے تخلیقی نوادر جیسا حسین نہیں ہو سکتا کیونکہ خدا احسن الخالقین ہے۔ اس سے تین نکات ہمارے سامنے آئے۔ (۱) فاطر صرف خدا ہو سکتا ہے کوئی اور نہیں۔ (۲) عملِ تولید حیوانی سطح پر طریق افزائش ہے اور (۳) مومن عملِ تخلیق میں خدا کا رفیق ہوتا ہے۔ تولید میں صرف تکرار ہوتی ہے۔ اس کی رو سے ہر حیوان' جن میں انسان بھی شامل ہیں' صرف اپنے جیسا بچہ پیدا کر سکتا ہے۔ اس میں ندرت نہیں ہوتی۔ ارتقاء نہیں ہوتا۔ فکر کی دنیا میں اسے تقلید کہتے ہیں۔ یعنی جو ہوتا چلا آرہا ہے اسی طرح ہوتا چلا جائے۔ تخلیق کے لئے نئی فکر، نئے خیال، نئی آرزو، نئے نئے مقاصد کا دل میں ابھرنا، نئی نئی تمناؤں کا بیدار ہونا شرطِ اولین ہے۔ آپ کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے جب تک آپ کے دل میں اس کے لئے ایک نیا خیال نہ ابھرے۔ مومن کی زندگی تخلیقی کارناموں کا مظہر ہوتی ہے۔ تقلید و تکرار اس کا شیوہ نہیں ہوتا۔ اقبال کے پیغام کا نقطۂ ماسکہ تخلیقِ مقاصد اور بیداریٔ آرزو ہے۔ وہ اپنی سب سے پہلی تصنیف "اسرارِ خودی" کے ابتدائی باب میں کہتے ہیں کہ

زندگانی را بقا از مدعاست
کاروانش را درا از مدعاست

اور ...

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

عملِ تخلیق کے لئے، زندگی کے بلند مقاصد پر یقین ضروری شرط ہے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ

بے یقیں را لذتِ تحقیق نیست
بے یقیں را لذتِ تخلیق نیست

اقبالؔ کے نزدیک ایمان کا فطری نتیجہ، تخلیقِ مقاصد ہے۔ وہ واشگاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ

ہر کہ او را لذتِ تخلیق نیست
نزدِ ما جز کافر و زندیق نیست

مومن کارگہِ کائنات میں اپنے عملِ تخلیق سے نت نئے اضافے کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کو اقبالؔ مردِ حُر یا بندۂ آزاد کہتا ہے۔ اس کے برعکس غلام ہے جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ:

کیشِ او تقلید و کارش آذری ست
ندرت اندر مذہب او کافری ست
تازگیہا وہم و شک افزایدش
کہنہ و فرسودہ خوش می آیدش (بندگی نامہ)

حضرتِ علامہ فکر کی تازگی کی اہمیت کے متعلق کہتے ہیں کہ:

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا!

اس کی تشریح (بالِ جبریل میں) ان الفاظ سے کرتے ہیں کہ:

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب
ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارا، لعلِ ناب

خدا نے اپنے عملِ تخلیق کے متعلق کہا تھا کہ یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ (۳۵/۱)۔ وہ اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق کائنات میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔ مومن بھی ندرتِ فکر و عمل سے نئی نئی ایجادات سے 'خدا کے تخلیقی پروگرام میں اس کا رفیق بن جاتا ہے۔ پولینڈ کا مفکر 'بارڈیو' اسی سلسلہ میں کہتا ہے کہ "امرِ تخلیق صرف خدا کی طرف سے انسان کی طرف نہیں آتا بلکہ خدا بھی انسان سے تخلیقی جدتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ انسانی آزادی کے کارناموں کا منتظر رہتا ہے"۔ (The Divine And The Human)

نسل و رنگ

اب تولید و تخلیق کے فرق کا اگلا مرحلہ دیکھئے:۔

جہاں تک انسان کی تمدنی زندگی کا تعلق ہے، تولید کی حیوانی سطح پر افراد کا باہمی رشتہ خون اور نسل کے اشتراک کی بنا پر ہوتا ہے۔ ایک خاص نسل کے گھوڑے، خاص نسل کے بیل، خالص نسل کی بھیڑیں، الگ الگ نوع قرار پاتی ہیں۔ ان میں نسلی اشتراک کے سوا کوئی قدر مشترک نہیں ہوتی جب انسان بھی حیوانی سطح پر زندگی بسر کرے

تو وہ بھی خون اور نسل کے اشتراک سے مختلف قبیلوں اور قوموں میں بٹ جاتا ہے لیکن جب وہ مومن کی سطح پر آجائے تو پھر ان میں وجۂ جامعیت خون اور نسل کا اشتراک نہیں رہتی۔ اقدار کا اشتراک وجۂ جامعیت یا معیارِ قومیّت قرار پاتا ہے۔ اس کو دو قومی نظریہ کہتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو حیوانی سطح پر زندگی بسر کریں۔ ایک قوم کے افراد۔ اور جو لوگ مومنانہ سطح پر زندگی بسر کریں۔ دوسری قوم کے اراکین۔ ماں باپ، زن و فرزند۔ اعزا و اقارب سے تعلقات۔ معاشرتی زندگی کا تقاضا ہے۔ لیکن اگر اس تقاضا اور اقدارِ خداوندی میں ٹکراؤ ہو تو یہ تعلقات، یا یوں کہئے کہ خون اور نسل کا اشتراک، کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ مومن ان رشتوں کو بلاتامل توڑ کر ان لوگوں سے الگ ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے کہا ہے کہ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ۔ اے جماعت مومنین! اگر تمہارے ماں باپ یا بھائی بند، ایمان کے مقابلہ میں کفر کو زیادہ پسند کرتے ہوں تو تم ان سے دوستداری کے تعلقات مت وابستہ رکھو۔ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔ (9/23) یاد رکھو! جو ایسا نہیں کرے گا، اور ان سے بدستور دوستانہ تعلقات وابستہ رکھے گا۔ تو اس کا شمار بھی ظالمین میں سے ہوگا۔

اس بنا پر اقبال نے کہا ہے کہ

قومِ تو از رنگ و خوں بالاتر است — قیمتِ یک اسودش صد احمر است

گر نسب را جزوِ ملت کردۂ — رخنہ در کارِ اُخوت کردۂ

(بے خودی)

یعنی۔

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی

اُڑ گیا دُنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گذر

میں چونکہ اس موضوع پر سالہا سال سے مسلسل اور متواتر لکھتا چلا آرہا ہوں۔ اس لئے اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ان اشارات سے آپ نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہوگا کہ اسلام میں قومیّت کا مسئلہ سیاسی یا تمدنی سوال نہیں۔ یہ کفر اور ایمان کا خطِ امتیاز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں یا انسانی سطح پر۔ حیوانی سطح زندگی کو کفر کہا جاتا ہے اور اقدارِ خداوندی کے مطابق انسانی سطحِ زندگی کو ایمان۔ قرآن کے عباد اللہ اور اقبال کے مردانِ مومن کا ایک امتیازی جوہر یہ بھی ہے کہ وہ خون اور نسل کے حیوانی رشتہ کے بجائے ایمان و اقدار کے انسانی (مومنانہ) رشتہ سے وابستہ ہوتے ہیں۔

رحم اور قوّت

اب ایک اور گوشے کی طرف آیئے۔ دنیا میں رحم اور قوت دو ایسے عناصر ہیں جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ یہ اکٹھے ہو ہی نہیں سکتے۔ عیسائیت نے خدا کو سرتا سر رحم قرار دیا ہے۔ اور قوت کے ہر قسم کے تصور کو شر سے تعبیر کیا۔ خدا کے اس تصور نے جس قسم کا ضابطۂ اخلاق مرتب کیا۔ اس کے نتائج و عواقب کے متعلق عصرِ حاضر

کا ایک عظیم مفکر 'وھائٹ ہیڈ' لکھتا ہے کہ:

اس ضابطہ کو اگر موجودہ معاشرہ میں نافذ کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ فوری موت کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ (Adventures Of Ideas)

اس تصور کے خلاف ردعمل کا انتہائی مظہر جرمن فلاسفر نیٹشے ہے جس کے نزدیک زندگی کا راز قوت اور بے پناہ قوت میں ہے۔ وہ اس خصوصیت کے سوا کسی قدر کا قائل ہی نہیں۔ اس تصور حیات نے کیا نتائج پیدا کئے۔ اس کی زندہ شہادت وہ جہنم ہے جس میں اس وقت ساری دنیا مبتلائے عذاب ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ دونوں تصورات باطل اور غلط نگہی پر مبنی ہیں۔ خدا ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ (۵۱/۵۸) یعنی بے انتہا محکم قوتوں کا مالک بھی ہے اور أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ (۷/۱۵۱) بھی۔ یعنی سب سے زیادہ رحم کرنے والا۔ وہ ظالم کی کلائی مروڑنے کے لئے صاحب قوت ہے۔ اور مظلوم کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لئے انتہائی شفقت و رحمت کا مظہر۔ بندۂ مومن خدا کی ان دونوں صفات کا حامل ہوتا ہے۔ اور اقبال نے ان صفات کے حسین و جمیل امتزاج کو مختلف اسالیب و انداز سے اس شرح و بسط سے بیان کیا ہے کہ اگر میں اس کی تفصیل میں جانا چاہوں تو اس کے لئے کئی نشستیں درکار ہوں گی۔ قرآن نے جماعت مومنین اور ان کے سربراہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ خدا کے پیغامبر محمدؐ اور اُن کے رفقاء کی کیفیت یہ ہے کہ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹) وہ حق و صداقت کے مخالفین کے لئے چٹان کی طرح سخت ہیں۔ اور باہمدگر حریر و اطلس کی طرح نرم۔ اقبال ان متضاد خصوصیات اور ان کے امتزاج کو انتہائی وجد و کیف کے عالم میں بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مومن کی کیفیت یہ ہے کہ

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

ضرب کلیم کی وہ تابندہ نظم جس کا مطلع ہے — ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن — اور جس کے چند اشعار میں اس سے پہلے پیش خدمت کر چکا ہوں۔ اس کے آخر میں کہا ہے۔ کہ مومن کی کیفیت یہ ہے:

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

بانگ درا کی مشہور نظم — طلوع اسلام — میں وہ مسلمان تک خدا کا یہ پیغام پہنچاتے ہیں کہ

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر　　شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گذر جا بن کے سیل تند رَو کوہ و بیاں سے　　گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

قیام و سجود

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَہُمْ

اس کے بعد قرآن کریم نے فدائیوں کی اس جماعت کی خصوصیت یہ بتائی کہ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا (۴۸/۲۹) تو انہیں دیکھے گا کہ کبھی رکوع میں جھکے ہوئے۔ کبھی سجدہ میں گرے ہوئے۔ علامہ اقبال مومن کی صلوٰۃ سے کئی نادر معانی اخذ کرتے ہیں۔ وہ کبھی کہتے ہیں کہ

بسوزد مومن از سوزِ وجودش　　گشود ہر چہ بستند از کشودش

جلالِ کبریائی در قیامش　　جمالِ بندگی اندر سجودش

عبد مومن کے قیام و سجود کے جلال و جمال کے حسین منظر سے "میرے افق ذہنی پر" بلا ساختہ افغانستان کی ایک شاعرہ پری بدخشی کی غزل کا ایک شعر نمودار ہوگیا۔ اس نے کہا ہے اور دیکھیے کس ساحرانہ انداز سے کہا ہے کہ

برخاستی! قیامتِ کبریٰ بلند شد

بنیش دمے! کہ فتنۂ محشر نشستہ بہ

لیکن اقبال کسی اور ہی مقام سے بات کرتا ہے۔ ارمغانِ حجاز کا ایک قطعہ آپ نے ابھی ابھی سن لیا۔ اسی مضمون کا دوسرا قطعہ ہے کہ

دو گیتی را صلا از قرأتِ اوست　　مسلماں لایموت از رکعتِ اوست

نداند کشتۂ ایں عصرِ بے سوز　　قیامت ہا کہ در قد قامتِ اوست

مومن کا قیام و سجود آئینہ دار ہے اس حقیقت کا کہ وہ ایک خدا کے حضور جھک کر دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے مردانہ وار کھڑا ہو جاتا ہے۔ سجدہ اگر بغیر قیام کے ہو تو وہ عیسائیت (بلکہ یوں کہیے کہ مسلکِ رہبانیت) کے خدا کا خود ساختہ تصور ہے۔ اور اگر قیام بلا سجدہ ہو تو وہ نیٹشے کے تصور کا (Super-Man) ہے جو اندھی قوت کا قہرمانی مجسمہ ہوتا ہے۔ قرآن نے "قوت اور اقدار خداوندی کے امتزاج کو نہایت بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَہُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایت اور میزانِ عدل دے کر بھیجا تاکہ لوگ عدل و انصاف کے مطابق زندگی بسر کریں۔ لیکن اس مقصد کے لئے نظری تعلیم یا پند و نصائح کافی نہیں تھے اس لئے وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ۔ ہم نے ان کے ساتھ شمشیر خاراشگاف بھی نازل کی۔ فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۵۷/۲۵) اگر اسے خدا کے نازل کردہ ضابطہ ہدایت کے مطابق استعمال کیا جائے تو وہ نوعِ انسان کے لئے بڑی منفعت بخش ثابت ہوتی ہے۔ ضابطۂ خداوندی اور اس کے ساتھ تلوار (یعنی مادی قوت)۔ یہ ہے اسلام۔ تلوار کے متعلق اقبال کہتا ہے:

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تو نے　　کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگردار
اس بیت کا یہ مصرعِ اول ہے کہ جس میں　　پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار

تنہا تلوار، بیتِ زندگی کا صرف ایک مصرع ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک اس کے ساتھ دوسرا مصرع نہ ہو، یہ شعر نہیں بن سکتا۔ وہ دوسرا مصرع اقتدارِ خداوندی کا ضابطہ ہے۔ اقبال نے اپنی زندہ و پائندہ تصنیف، جاوید نامہ میں تلوار اور قرآن کے باہمی تعلق کو ایسے عمیق لیکن درخشندہ انداز سے بیان کیا ہے کہ جوں جوں چشمِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، انسان وجد میں آجاتا ہے۔ (مغلیہ خاندان کے) شاہ عالم کے زمانہ میں، پنجاب کے گورنر، نواب خان بہادر خان کی صاحبزادی محترمہ شرف النساء کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہمیشہ کمر سے تلوار باندھے رکھتی تھیں اور ہاتھ میں قرآن۔ اور انہوں نے اپنی والدہ کو وصیت کی تھی کہ اس کی وفات کے بعد یہ دونوں چیزیں اس کی قبر کے اُوپر رکھ دی جائیں۔

اقبال اپنے آسمانی سفر میں جنت الفردوس میں اس شہزادی والا تبار سے ملتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں کہ اس کے اس شعارِ زندگی اور آخری وصیت کی حکمت کیا تھی۔ وہ جواب میں کہتی ہیں کہ میں تلوار اور قرآن کو اس لئے ساتھ رکھتی تھی کہ

این دو قوت حافظِ یک دیگر اند　　کائناتِ زندگی را محور اند
مومناں را تیغ با قرآں بس است　　تربتِ ما را ہمیں ساماں بس است

تلوار سے مراد، عسکری قوت ہی نہیں بلکہ ہر قسم کا اقتدار ہے۔ جب دین بلا اقتدار کے ہو تو وہ مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کا منتہیٰ وعظ و نصیحت کی منت خوشامد سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اور جب اقتدار، ضابطہ خداوندی سے الگ ہو جائے تو وہ ہر دور میں فرعونیت کا مظہر بن جاتا ہے۔ ضربِ کلیم کی اس جلال آفریں نظم کو پڑھیئے اور دیکھئے کہ حکیم الامت نے اس حقیقت کو کیسے واشگاف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

تاریخِ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے　　صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے　　عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لا دیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر　　ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

واضح تر الفاظ میں کہ :

جلالِ پادشاہی ہو، کہ جمہوری تماشا ہو
جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

مومن کی سیاست دین کے تابع رہتی ہے۔ قرآن اس کی تلوار کا محافظ ہوتا ہے کہ وہ بے راہ رو نہ ہونے پائے اور تلوار قرآن کی محافظ کہ وہ مذہب بن کر نہ جائے۔ اس طرح مومن کی تلوار، اس کی قوت، اس کا اقتدار، اس کی سیاست، اس کی مملکت، دنیا میں مقاصدِ خداوندی کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جب مکہ کے مظلوموں نے اپنی امداد کے لئے خدا سے فریاد کی تو اس نے کس طرح مدینے

کے صاحبِ اقتدار مسلمانوں سے کہا کہ تم اُن مظلوموں کی فریاد کو سنتے نہیں ! تم اُن کی مدد کے لئے کیوں نہیں اُٹھتے ؟ اسی حقیقت کو اقبال نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ :

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

مومن کو خدا کے قانون مکافات کی محکمیت پر بھروسہ ہوتا ہے اور خدا کو جماعتِ مومنین کی استقامت اور پامردی پر بھروسہ۔ کہ جب یہ بہ حیثیت خدا دندی کے بروئے کار لانے کے لئے اُٹھتے ہیں تو اس کی (مشیت) بروئے کار آ کر رہتی ہے۔ اس لئے کہ اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ۔ یہ خدا کی پارٹی ہے۔ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵۸/۲۲) اور سن رکھو کہ خدا کی پارٹی کامیاب ہو کر رہتی ہے۔ صرف کامیاب ہی نہیں۔ فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ۔ (۵/۵۶)۔ یہ سب پر غالب آ کر رہتے ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کوئی قوم ان سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ آگے بڑھنا تو ایک طرف، کوئی قوم ان کے ہمدوش نہیں ہو سکتی۔ ان کی برابری کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتی۔

مومنے بالائے ہر بالا ترے
غیرتِ او بر نتابد ہمسرے

اس لئے کہ ان کے خدا کا ارشاد ہے کہ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳/۱۳۸) جب تم مومن ہو تو پھر تم سے بڑا کوئی نہیں ہو سکتا۔ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا۔ (۴/۱۴۱) یہ ہو نہیں سکتا کہ کفار کبھی مومنوں پر غالب آ جائیں۔ جب صورت یہ ہے تو پھر واضح ہے کہ دنیا میں (خدا کی طرف سے) حقِ حکومت صرف جماعتِ مومنین کو حاصل ہوگا۔ کسی اور کو نہیں۔

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

مومن جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے، اپنے آپ کو اس ماحول کے مطابق نہیں ڈھال لیتا۔ وہ اس ماحول کو اپنے نظریات و تصورات کے مطابق ڈھالنے کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔ اسی کا نام انقلاب ہے اور مومن دنیا میں سب سے بڑا انقلابی ہوتا ہے۔ مثنوی اسرار و رموز میں ہے۔

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار	با مزاجِ او بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں	می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیادِ موجودات را	می دہد ترکیبِ نو ذرات را
گردشِ ایام را برہم زند	چرخِ نیلی فام را برہم زند
می کند از قوتِ خود آشکار	روزگارِ نو کہ باشد سازگار

اس قسم کا انقلاب، مردِ مومن کا ایمان ہی برپا کر سکتا ہے۔ اور اس کا طریق یہ ہے کہ:

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ	پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار　　اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

(Martin Bubar) نے اس حقیقت کو جس خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے جی نہیں چاہتا کہ اس کیف میں آپ کو شریک کیئے بغیر آگے بڑھا جائے وہ کہتا ہے کہ

جب قوتِ تخلیق ہم پر اثر انداز ہوتی ہے تو وہ اپنے آپ کو جلا کر ہمارے اندر جذب ہو جاتی ہے اور اس آگ سے بھڑکتے ہوئے شعلوں سے ہماری تخلیق نو کرتی ہے۔ ہم اس کے آتشیں جلال کے حضور میں پہلے کانپتے ہیں گڑگڑاتے ہیں، سربسجود ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد ہم خود عملِ تخلیق میں شریک ہو جاتے ہیں اور خالق سے جا ملتے ہیں۔ اس کے معاون اور رفیق کی حیثیت سے۔ (I And Thou)

اس قسم کا جہان نو، مردِ مومن کی قوتِ بازو ہی سے وجود میں آسکتا ہے۔ ایسا انقلاب کوئی اور پیدا نہیں کرسکتا جس میں کیفیت یہ ہو کہ یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ (۱۴/۴۸) یہ زمین بدل جائے۔ یہ آسمان بدل جائے وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (۱۴/۴۸) اور ان میں ایک نئی دنیا ابھرے جس میں صرف خدائے واحد کا سکہ رواں ہو۔ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (۳۹/۶۹) اور زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔ یہ ہیں وہ مردانِ حُر جو ہیگل کے "روحِ زمانہ" اور مارکس کے "تاریخی وجوب" کے تابع مجبور و مقہور زندگی بسر کرنے کے بجائے تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیتے ہیں۔ بار دیو کے الفاظ ہیں :

یہی وہ انسان ہے جو تاریخ اور کائنات کی زندگی میں جذب ہے اور اس میں باعمل و متحرک رہتا ہے لیکن تاریخ اور کائنات سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ انہیں اپنے ارادوں کے تابع ڈھال لیتا ہے۔ اس قسم کا انسان صرف اپنی ذات کی یا ان لوگوں کی ذمہ داری ہی نہیں لیتا جو اس کے گرد و پیش ہوں، بلکہ تمام نوعِ انسان کے مقدرات کی ذمہ داری اپنے سر لے لیتا ہے۔ (The Divine And Human)

قرآن کے الفاظ ہیں وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (۲/۱۴۳) اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی اُمت بنایا تاکہ تم تمام نوعِ انسان کے اعمال و کردار کی نگرانی کرو۔

یہ ہے مومن کا مقام اس دنیا میں۔ اور چونکہ زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ آگے بھی چلتی ہے۔ اس لئے جہانِ فردا میں بھی امامت کا سزاوار یہی ہوگا۔ اسی سے اقبال نے کہا ہے کہ :

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن
قدم اٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں

ؔ بوبر چونکہ یہودی ہے اس لئے اس کا اشارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ طور کی طرف ہے۔

بانگ درا میں ہے:

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

اور بال جبریل کی یہ رقصندہ و سرائندہ غزل

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

قرآن کریم کی رو سے تو جنت بھی مومن کے سفر حیات کی آخری منزل نہیں۔ راستے میں ستانے کا مقام ہے۔ یعنی دم لے کر آگے چلنے کا مقام۔ کاروان حیات نے اس کے بعد بھی کئی مزید ارتقائی منازل طے کرنی ہیں۔ اسی لئے اہل جنت کے متعلق کہا گیا ہے کہ نُوۡرُهُمۡ يَسۡعٰى بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَبِاَيۡمَانِهِمۡ (ان کی پیشانی کا) نور ان کے آگے اور دائیں بائیں راستے روشن کرتا جائے گا۔ يَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اَتۡمِمۡ لَـنَا نُوۡرَنَا وَاغۡفِرۡ لَـنَا (۶۶/۸) اور ان کی پکار یہ ہوگی کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمارے نور کی تکمیل کر دے۔ اس نورانی سفر کی آخری منزل کون سی ہوگی، اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا گیا۔ اس لئے کہ ہمارے شعور کی موجودہ سطح پر یہ حقیقت ہمارے حیطۂ ادراک میں آ نہیں سکتی تھی۔ اس کی سمت کا اشارہ کرتے ہوئے اتنا کہا گیا کہ وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الۡمُنۡتَهٰى (۵۳/۴۲)۔ اس سفر کا منتہیٰ تیرے رب کی طرف ہے۔ یاد رہے کہ اہل تصوف کا جو نظریہ ہے کہ انسانی ذات' ذات خداوندی کا ایک جزو ہے' اور زندگی کی تمام تگ و تاز کا ماحصل یہ ہے کہ یہ جزو اپنی اصل یعنی ذات خداوندی میں جا کر جذب اور فنا ہو جائے' یہ تصور قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے اور دوسروں کے ہاں سے مستعار لیا ہوا۔ خود اقبال بھی اس نظریے کے خلاف ہے۔ اس کی تلقین یہ ہے کہ

بجاں باذات حق خلوت گزینی — ترا او بیند و اورا تو بینی
بخود محکم گذار اندر حضورش — مشو ناپید اندر بحر نورش

(گلشن راز جدید)

یہ بہرحال ایک الگ موضوع ہے جس کی وضاحت کا یہ مقام نہیں۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ مومن وہ ہے جو زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا چلا جائے۔ اس کے مقامات کا ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔

مقام بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر — زمیں سے تا بہ ثریا تمام لات و منات
حریم ذات ہے اس کا نشیمن ابدی؎ — نہ تیرہ خاک لحد ہے نہ جلوہ گاہ صفات

؎ ذات خداوندی میں فنا ہو کر نہیں' بلکہ اُسی حریم میں' اس سے الگ۔

خود آگہاں کہ ازیں خاکداں بروں جستند
طلسمِ مہر و سپہر و ستارہ بشکستند (ارمغانِ حجاز)

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا 'قرآن کریم کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ اس میں مختلف پہلوؤں اور متنوع گوشوں سے 'مردانِ مومن کی خصوصیات و کیفیات کا تذکرہ ہے' اور علامہ اقبالؒ کا پیغام بھی چونکہ حقائق قرآنی ہی کا ترجمان ہے اس لئے اس میں بھی مومن کی صفات و تجلیات کو پہلو بدل بدل کر بیان کیا گیا ہے۔ اکثر مقامات پر وہ پھول کی بکھری ہوئی پتیوں کی طرح فرداً فرداً سامنے آتی ہیں اور کہیں انہیں گلدستہ کی طرح جامع حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ میں ایسے مقامات کی دو ایک مثالیں پیش کرتا ہوں تاکہ اقبالؒ کے مردِ مومن کی ایک جھلک بیک نظر آپ کے سامنے آجائے۔ وہ اپنی سب سے پہلی تصنیف 'مثنوی اسرار و رموز' میں سورۃ اخلاص کی آیت' وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ' کی شرح کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

رشتہ با لَمْ يَكُنْ باید قوی	تا تو در اقوام بے ہمتا شوی
آنکہ ذاتش واحد است و لاشریک	بندہ اش ہم در نسازد باشریک
مومن بالائے ہر بالا ترے	غیرتِ او بر نتابد ہمسرے
پیشِ باطل تیغ و پیشِ حق سپر	امر و نہی او عیارِ خیر و شر
عفو و عدل و بذل و احسانش عظیم	ہم بقہر اندر مزاج او کریم
ساز او در بزمہا خاطر نواز	سوز او در رزمہا آہن گداز
زیرِ گردوں می نیابد دلش	برفلک گیرد قرار آب و گلش

میں یہ اشعار پڑھ رہا ہوں اور میرے حافظہ میں ایک ایسے واقعہ کی یاد تازہ ہو رہی ہے جو ہے تو ذاتی لیکن جی نہیں چاہتا کہ میں اسے یہاں بیان کئے بغیر آگے بڑھ جاؤں۔ میری ابتدائی تعلیم و تربیت' میرے لائق صد احترام' دادا جان (مرحوم و مغفور) کے زیر سایہ عاطفت ہوئی تھی۔ انہوں نے حضرت علامہؒ کی یہ مثنوی مجھے خود پڑھائی تھی۔ اس وقت میری عمر چھوٹی سی تھی۔ انہوں نے جب اقبالؒ کے اشعار اور قرآن کی روشنی میں' مردِ مومن کی صفات و خصائص بیان کیں تو مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور میں نے انتہائی استعجاب اور کچھ خوف کے سے ملے جلے جذبات کے ساتھ ان سے کہا کہ بابا جان! مردِ مومن اگر ایسا ہوتا ہے تو مجھے تو آج ساری دنیا میں کوئی مردِ مومن نظر نہیں آتا۔ انہوں نے اپنے مخصوص محبت بھرے انداز سے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ آج مردِ مومن کہیں نظر نہیں آتا۔ لیکن غنیمت ہے کہ اگر ہمارے دور میں کوئی مومن نہیں تو دنیا میں آج کوئی کافر بھی موجود نہیں۔ اگر صورت یہ ہوتی کہ ابو جہلؔ تو ہوتا اور عمرؓ نہ ہوتا۔ تو پھر البتہ گھبرانے کی بات تھی۔ دنیا آج کفر اور ایمان دونوں کی طرف سے بے اعتنا (Indifferent) ہوتی جا رہی ہے۔ اور جو لوگ زندگی کے حقائق کی

طرف سے (Indifferent) ہو جائیں ان سے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ یہ تھا جو کچھ دادا جان (مرحوم) نے فرمایا۔ اس واقعہ کے کافی عرصہ بعد جب ضربِ کلیم سامنے آئی تو اس کے شروع ہی میں یہ شعر نظر پڑا۔

نہ دیر میں، نہ حرم میں خودی کی بیداری
کہ خاوراں میں ہے قوموں کی روح تریاکی

تو میری سمجھ میں آیا کہ دادا جان نے اتنا عرصہ پہلے کیا بات کہی تھی۔

یہ جملہ معترضہ تھا۔ میں کلامِ اقبال سے مردِ مومن کی صفات و خصوصیات کی مثالیں پیش کر رہا تھا۔ ضربِ کلیم میں وہ مردِ بزرگ کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

اس کی نفرت بھی عمیق، اس کی محبت بھی عمیق
قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق

پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں
ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق

انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو
شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا، سب کا رفیق

مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزادہ، معانی میں دقیق

اس کا انداز نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

میں ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں کہ جب اقبال کے کلام سے مردِ مومن کی خصوصیات میرے سامنے آئیں تو میں نے ایک تاسف کہا کہ دادا جان! مجھے اس بھری دنیا میں کوئی مومن نظر نہیں آتا۔ اب سوچئے کہ جب کلامِ اقبال کے سامنے آنے سے میری یہ کیفیت ہو گئی تھی تو اس باب میں خود اقبال کی کیفیت کیا ہوگی؟ اقبال ساری عمر مردِ مومن کی تلاش کرتا رہا۔ اور گلی گلی، کوچے کوچے، صحرا صحرا، دریا دریا، پکارتا گیا کہ:

درمعرکہ بے سوزِ تو ذوقے نتواں یافت
اے بندۂ مومن! تو کجائی؟ تو کجائی؟

اس کی ساری عمر اسی پکار میں گذر گئی لیکن زندگی بھر کی طلب و جستجو کے باوجود جب اُسے مردِ مومن کی آواز کہیں سے سنائی نہ دی تو وہ ہار تھک کر بیٹھ گیا، اور انتہائی کرب و الم کے ساتھ پکار اُٹھا کہ

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش

تمدن، تصوف، شریعت، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمت روایات میں کھو گئی

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

اور یہ اس لئے کہ

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است
رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ

دینِ حق از کافری رسوا تر است
زانکہ مُلّا مومنِ کافر گر است

لہٰذا مردانِ مومن کہاں سے آئیں؟

والسلام

حقائق و عبر

۱- سچ ـ جھوٹ سے شکست کھا گیا-

میکیاولی سیاست میں لیڈر کی کامیابی کے لئے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اگر اُسے کہیں ناکامی ہو تو وہ اپنے متبعین کے دل میں یہ خیال پیدا نہ ہونے دے کہ وہ ناکامی اس کی کسی غلط تدبیر کا نتیجہ ہے یا اس امر کی دلیل کہ اس کی پارٹی حق پر نہیں۔ اس کی ایک زندہ شہادت ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے سلسلے میں ہمارے سامنے آئی۔ انتخابات کے لئے ووٹنگ سات دسمبر کو ہونے والی تھی اور اُس سے ایک دن پہلے مودودی صاحب نے یہ فرمایا تھا کہ:

> انتخابات میں شکست سوشلسٹوں کا مقدر بن چکی ہے جماعت اسلامی کے نمائندے انتخابات میں بڑی تعداد میں کامیاب ہونگے۔ ماضی قریب میں جماعت اسلامی کی اہمیت اور مرکزیت میں روز بروز تیزی سے اضافہ ہوا ہے اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ ان حالات میں جماعت کے ہارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن دوسری ہی شام ووٹنگ کے نتائج کی رو سے جماعت اسلامی کو ایسی ذلت آمیز شکست ہوئی جس کی کہیں مثال نہیں ملتی۔ جب خود مرکز جماعت میں یہ سوال اٹھایا گیا کہ ہمیں یہ شکست کیوں ہوئی ہے تو مودودی صاحب نے اس کے جواب میں یہ فرمایا کہ اگر ہمیں شکست ہو گئی ہے تو یہ کون سی انوکھی ہے۔

> بعض انبیاء ایسے گزرے ہیں جنہوں نے ساری عمر دین کی طرف دعوت دینے میں کھپا دی اور ایک آدمی بھی ان پر ایمان نہ لایا۔ اس کے برعکس جماعت اسلامی کو گذشتہ ایک سال کی جدوجہد میں کئی لاکھ نئے حامی مل گئے۔

اللہ تعالیٰ نے تو یہ فرمایا تھا کہ کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیْ (۵۸/۲۱) خدا نے یہ لکھ رکھا ہے کہ میں اور ہمارے رسول یقیناً غالب رہینگے، اور مودودی صاحب کا خدا کے رسولوں کے متعلق یہ ارشاد ہے۔ (معاذ اللہ) (تفصیل ان امور کی طلوع اسلام بابت جنوری و فروری ۱۹۷۱ء میں ملے گی) جماعت کے ترجمان اخبار ایشیا نے مودودی صاحب کے جواب کے سلسلے میں کہا تھا کہ "اسی سے مرجھائے ہوئے چہرے کھل اٹھے۔

یہی چہرے جب گذشتہ مارچ میں اسلامی جمعیت طلبہ کی سالانہ تربیت گاہ میں جمع ہوئے اور ان سے مودودی صاحب نے خطاب کیا تو ان سے یہ سوال پوچھا گیا کہ:

جماعت اسلامی تیس چالیس سال کی مسلسل کوششوں اور قربانیوں کے باوجود اقتدار حاصل نہ کر سکی اور پاکستان پیپلز پارٹی چند سال کے اندر ہی اندر اقتدار تک پہنچ گئی اور آج وہی ملک کے سیاہ وسفید کی مالک ہے۔ کیا یہ بات تحریک اسلامی کی غیر مقبولیت کا ثبوت نہیں۔ کارکنان اس کے نتیجے میں مضمحل ہو رہے ہیں۔

(ایشیا بابت ۱۷/ مارچ ۱۹۷۴ء)

اس کے جواب میں مودودی صاحب نے جو کچھ فرمایا وہ غور طلب بھی ہے اور جگر گداز بھی۔ انہوں نے کہا کہ:

جماعت اسلامی کو سچائی نے شکست نہیں دی ہے جھوٹ نے شکست دی ہے۔ جماعت اسلامی اگر سچائی سے شکست کھاتی تو فی الواقعہ اس کے ڈوب مرنے کا مقام تھا لیکن چونکہ اس نے جھوٹ سے شکست کھائی ہے اس لئے اس کا سر فخر سے بلند ہے۔ وہ جھوٹ کے مقابلے میں جھوٹ نہیں لائی، وہ بد اخلاقی کے مقابلے میں بد اخلاقی نہیں لائی۔ اس نے سڑکوں پر رقص نہیں کیا، اس نے غنڈوں کو منظم نہیں کیا، اس نے سڑکوں پر ناچ نہیں ناچا۔ اس نے بر سرِ عام گالیاں نہیں دیں اور اس نے لوگوں سے جھوٹے وعدے نہیں کئے۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ جھوٹے وعدوں کے فریب میں لوگ مبتلا ہو رہے ہیں۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ کچھ نہ کچھ آپ کو بھی کرنا چاہئے لیکن میں اسی زمانے میں برابر لوگوں سے کہتا رہا کہ چاہے آپ کو ایک نشست بھی نہ ملے لیکن آپ سچائی کے راستے سے نہ ہٹیں۔ (ایضاً)

اس جواب میں غور طلب بات یہ ہے کہ انتخابات سے مہینوں پہلے سے مختلف جماعتیں اپنے اپنے پروگرام کے مطابق مصروفِ جدوجہد تھیں۔ (مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق) مخالف پارٹی یا پارٹیاں دھوکہ، فریب جھوٹ کے تمام حربے استعمال کر رہی تھیں اور مودودی صاحب نے اپنی جماعت سے تاکیداً کہہ رکھا تھا کہ وہ اس سلسلے میں کوئی غلط قدم نہ اٹھائیں۔ ۶/ جنوری تک یہ سب کچھ مودودی صاحب کی آنکھوں کے سامنے ہوتا رہا۔ سوال یہ تھا کہ پھر مودودی صاحب نے کس بنا پر یہ کہہ دیا تھا کہ شکست فریقِ مقابل کو ہو گی اور جماعت اسلامی کے ہارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسری بات جسے ہم نے جگر گدازی سے تعبیر کیا ہے یہ ہے کہ مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ:

سچ نے جھوٹ سے شکست کھائی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا سچ کبھی جھوٹ سے شکست کھا سکتا ہے۔ یہ سوال بڑا اہم ہے۔ قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے کہ:

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱/۱۸)

ہم باطل پر حق کی ضربیں لگاتے رہتے ہیں۔ سو حق، باطل کا بھیجا نکال دیتا ہے۔ اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ اٹھتا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے کھلے کھلے الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ حق اور باطل، جھوٹ اور سچ میں ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے۔

اور جس کے نتیجے میں حق، باطل کا بھیجا نکال دیتا ہے اور باطل خاسر و ناکام رہ کر بھاگ جاتا ہے۔ پھر قرآن کریم نے حق کی علمبردار جماعت کو حزب اللہ کہہ کر پکارا ہے اور اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ:

فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ - (۵/۵۶)

یہ یقینی بات ہے کہ حزب اللہ غالب آکر رہتی ہے۔

دوسری جگہ اُس نے کہا ہے کہ:

كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ - (۳۰/۴۷)

ہم پر مومنوں کی مدد کرنا واجب ہے۔

اور پھر یہ بھی کہ:

اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ - (۳/۱۳۹)

اگر تم مومن ہو تو تم سب پر غالب رہو گے۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ سوچئے کہ اگر یہ کہا جائے کہ جھوٹ، سچ کو شکست دے سکتا ہے تو خدا کے ان فیصلوں کے متعلق کیا کہا جائے۔ ایسا تو ہو سکتا ہے کہ میدانِ جنگ میں کسی تدبیری غلطی کی وجہ سے حزب اللہ کو عارضی طور پر پیچھے ہٹنا پڑ جائے لیکن (خدا کے وعدوں کے مطابق) یہ نہیں ہو سکتا کہ باطل، حق پر اور جھوٹ، سچ پر غالب آجائے۔

مغربی نظامِ جمہوریت کے ذریعے انتخابات میں باطل کی جنگ، باطل سے ہوتی ہے۔ اس میں جو زیادہ قوت فراہم کر لیتا ہے، کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ تھی ۱۹۷۰ء کے انتخابات کی حقیقت۔ ظاہر ہے کہ اگر مودودی صاحب اس کا اعتراف کر لیتے تو ان کے حق و صداقت کے علمبردار ہونے کے دعاوی کی عمارت ڈھیر ہو کر رہ جاتی۔ انہوں نے پہلے انتہائی دیدہ دلیری سے یہ کہا کہ اگر ہمیں شکست ہو گئی ہے تو اس میں کونسی ناکامی کی بات ہے۔ (معاذ اللہ) ایسے انبیا بھی گزرے ہیں جو ساری عمر حق و صداقت کے لئے مصروفِ جدوجہد رہے لیکن انہیں ایک بھی پیروکار نہ مل سکا اور ہمیں تو ایک سال میں لاکھوں نئے حامی مل گئے ہیں۔ اور اب یہ فرما رہے ہیں کہ جھوٹ نے سچ کو شکست دے دی ہے۔

مصیبت یہ ہے کہ مودودی صاحب کے گرد و پیش جو "خواص" ہیں وہ بالعموم تنخواہ دار ہیں، اس لئے ان میں یہ جرأت ہی نہیں ہو سکتی کہ وہ مودودی صاحب کی کسی بات پر اعتراض کریں اور ناتجربہ کار طلباء اور عوام کے سامنے ان کی شخصیت کو اتنا مقدس بنا دیا گیا ہے کہ وہ ان کے خلاف دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی خیال نہیں لا سکتے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ مودودی صاحب جو جی میں آتا ہے، بلا دھڑک کہتے چلے جاتے ہیں۔

۲۔ ایک الگ کلمہ

تحریک پاکستان کے دوران مودودی صاحب کی کتاب "سیاسی کشمکش" (حصہ سوم) شائع ہوئی تھی۔ اس میں

اس تحریک کی شدت سے مخالفت کی گئی تھی اور بانیٔ تحریک، قائداعظم کے خلاف بہت کچھ کہا گیا تھا۔ بنیادی نقطہ اُس میں یہ تھا کہ مودودی صاحب موجودہ مسلمانوں کو پیدائشی مسلمان قرار دیتے تھے اور اپنے آپ اور اپنے رفقاء کو حقیقی مسلمان ٹھہراتے تھے۔ یعنی انہوں نے وہیں اپنے آپ کو باقی مسلمانوں سے الگ کر لیا تھا چنانچہ جب انہوں نے ۱۹۴۱ء میں اپنی جماعت کی بناء ڈالی تو اُس وقت جو لوگ اُس میں شامل ہوئے اُنہوں نے مودودی صاحب کے "دستِ حق پرست" پر کلمہ کی تجدید کی۔ پاکستان میں آنے کے بعد بھی انہوں نے اس تفریق کو بدستور قائم رکھا اور کہا کہ ان کی جماعت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے ملک کے صالحین کو باقیماندہ مسلمانوں سے الگ کر لیا ہے۔ یہ جماعت اپنے میں اور باقی مسلمانوں میں جس قدر بُعد اور افتراق سمجھتی ہے اُس کا اندازہ مودودی صاحب کے اُس مقالہ سے لگ سکتا ہے جو جماعتِ اسلامی کے ترجمان، ایشیا، کی ۱۲ مارچ ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ اُس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

> جو لوگ ایک ہی عقیدہ، ایک ہی نصب العین، اور ایک ہی مقصد رکھتے ہوں ان کے لئے ایک جماعت بن جانے کے سوا چارہ نہیں اور ان کا ایک جماعت بن جانا بالکل ایک فطری امر ہے۔ وحدت کلمہ کا لازمی نتیجہ اتحاد و اجتماع ہے اور افتراق صرف اُس جگہ ہوتا ہے جہاں کلمہ متفرق ہو۔

اس سے ظاہر ہے کہ جماعتِ اسلامی والوں کا عقیدہ، نصب العین۔ اور کلمہ باقی مسلمانوں سے الگ ہے اور اسی بنا پر انہوں نے ایک الگ جماعت بنانا ضروری سمجھا۔ کلمہ کے معنی نظریۂ زندگی، مقصدِ حیات، نصب العین، کچھ ہی لیجئے، ظاہر ہے کہ اس جماعت کا یہ کلمہ باقی مسلمانوں سے الگ ہے۔ ہم شروع سے کہتے چلے آ رہے ہیں کہ جس طرح مسلمانوں نے میرزا غلام احمد صاحب (قادیانی) کی ابتدائی تبلیغی کوششوں سے متاثر ہو کر ان کے حقیقی عزائم کے متعلق دھوکہ کھایا تھا بعینہٖ وہی کچھ مودودی صاحب کے سلسلے میں ہو رہا ہے۔ یہ تحریک، اسلام اور مسلمانوں کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے جس کا عام طور پر احساس نہیں کیا جا رہا۔

مودودی صاحب نے آگے چل کر کہا ہے کہ:

> جماعت کے اندر جماعت بنانے کی کوشش کبھی نہ کی جائے۔

یعنی ان کے نزدیک اُمت کے اندر ایک جماعت بنانے میں تو کوئی حرج نہیں لیکن ان کی جماعت کے اندر جماعت بنانا بہت بڑا جرم یا گناہ ہے۔ واضح رہے کہ تقسیمِ کار کے اصول کے مطابق، اُمت کے اندر کسی خاص پروگرام کے لئے کوئی تنظیم قائم کرنا اور بات ہے اور عقیدہ، نصب العین یا کلمہ کی علیحدگی کی بنیاد پر ایک الگ جماعت قائم کرنا اور بات۔ سوچئے کہ اُمتِ مسلمہ کس طرح وجود میں آئی ہے۔ اس کا جواب واضح ہے۔ اس اُمت کے افراد وہ لوگ قرار پاتے ہیں جن کا عقیدہ، نصب العین یا کلمہ دوسرے انسانوں سے مختلف ہوتا ہے۔ انہی بنیادوں پر اگر کوئی الگ جماعت بنائی جائے گی خواہ اس کے افراد مسلمانوں کے اندر سے ہی کیوں نہ لئے جائیں تو وہ ایک الگ اُمت ہو گی۔

یاد رکھئے ہم، آپ، اور دُنیا کے تمام مسلمان اُمتِ محمدیہ کے افراد ہیں[*]۔ ہوا یہ ہے کہ یہ اُمت، دین

[*] ہم "احمدیوں" یا بہائیوں کے متعلق بات نہیں کر رہے۔

کے حقیقی مفہوم اور اسلام کی غایت کو فراموش کرچکی ہے یا اس کی طرف سے غافل ہو چکی۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ دین کی حقیقت کو اس امت کے سامنے پھر سے اُجاگر کیا جائے اور اس کی غایت کی اُنہیں یاد دہانی کرائی جائے۔ اس مقصد کے لئے ایک تنظیمی پروگرام کے مطابق جدوجہد کی جائے تو وہ زیادہ نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔ طلوعِ اسلام نے اسی طریق کار کی طرح ڈالی ہے۔ اُس نے نہ کوئی نئی پارٹی بنائی ہے نہ فرقہ۔ نہ کوئی الگ عقائد وضع کئے ہیں نہ کوئی مجدّد اگانہ کلمہ اختیار کیا ہے۔ نہ اس نے ارکانِ اسلام — نماز، روزہ وغیرہ — کی کوئی نئی شکلیں وضع کی ہیں۔ نہ ان میں کسی قسم کا اضافہ کیا ہے۔ یہ ان تمام امور میں باقی اُمت کا ہمنوا ہے اور اپنے آپ کو ان سے اعلیٰ، افضل، برتر یا زیادہ صالح بھی نہیں سمجھتا۔ یہ اُمت کے سامنے قرآن کی متعین کردہ منزل، اور مقصود کو لاتا ہے اور اُس سے کہتا یہ ہے کہ ہمیں چاہیئے کہ ہم اس کے مطابق اپنا نظامِ زندگی متشکل کرلیں۔ قرآن کریم دین میں افتراق کو شرک قرار دیتا ہے۔ طلوعِ اسلام نے یہ طرح ڈالی ہے کہ اپنے آپ کو اُمت سے الگ سمجھے اور کئے بغیر اصلاح کی تدابیر کی جائیں۔ یہ جو اس کے خلاف پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ یہ ایک الگ فرقہ ہے۔ تو یہ سارا پراپیگنڈہ بالواسطہ یا بلاواسطہ جماعتِ اسلامی کا پیدا کردہ ہے۔ اور مقصد اس سے یہ ہے کہ اُس جماعت کی حقیقت اُمت کے سامنے بے نقاب نہ ہونے پائے۔

یہ بھی درست، وہ بھی ٹھیک۔

جماعت اسلامی کے ترجمان 'ایشیا' نے ۷ اپریل ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں جماعت اسلامی کے اُس مُلک گیر اجتماع کی روئداد شائع کی ہے جو حال ہی میں لاہور میں منعقد ہوا تھا۔ اُس میں، اُس نے آخری کھلے اجلاس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بانیٔ تحریک مولانا مودودی صاحب اسٹیج پر تشریف فرما تھے۔ امیر جماعت، میاں طفیل محمد صاحب نے

> پاکستان کی ستائیس سالہ تاریخ کا اجمالی ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے یہ الفاظ تاریخ میں سنہری حروف میں ثبت ہیں کہ مطالبۂ پاکستان کا مطلب صرف ایک ٹکڑا زمین کا حصول نہیں ہے بلکہ اسے اسلام کی تجربہ گاہ بنانا ہے۔

وہ یہ الفاظ اُن مودودی صاحب کی موجودگی میں ان کے روبرو کہہ رہے تھے جنہوں نے مطالبۂ پاکستان کی شروع سے آخر تک مخالفت کی۔ جنہوں نے قائداعظم اور ان کے رفقا کے متعلق لکھا کہ:

> افسوس کہ لیگ کے قائداعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں، جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے پرکھتا ہو . . . . . ان کے خیالات۔ نظریات اور طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نظر نہیں آ سکتی۔	(سیاسی کشمکش حصہ سوم)

اور واضح الفاظ میں کہا کہ :

مسلم لیگ کے کسی ریزولیشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں کی کسی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ اُن کا آخری مطمحِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔

یہ باتیں انہوں نے ۱۹۴۱ء میں کہی تھیں۔ وہ تحریک کے دوران اس کی اسی طرح مخالفت کرتے رہے۔ حتیٰ کہ اپریل ۱۹۴۷ء میں ٹانک میں جماعت اسلامی کے ایک اہم اجتماع میں ایک سوال کے جواب میں یہ کہا کہ :

یہ تحریک غیر اسلامی ہے اس لئے ہم اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

پھر انہوں نے قیامِ پاکستان کے بعد جون ۱۹۴۸ء کے ترجمان القرآن میں اس تحریک پر بحث کرتے ہوئے لکھا کہ :

یہ بحث اُن سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلے ربع صدی میں ہماری سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے۔

یہ ہیں چند ایک مثالیں ان ارشاداتِ گرامی کی جو مودودی صاحب تحریکِ پاکستان اور اُس کے قائد کے متعلق فرمایا کرتے تھے۔ اور اب امیر جماعت اسلامی، انہی مودودی صاحب کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی جماعت کے ہزاروں سامعین کی موجودگی میں یہ کہہ رہے ہیں کہ قائد اعظم کے یہ الفاظ تاریخ میں سنہری حروف میں ثبت ہیں کہ مطالبۂ پاکستان کا مطلب صرف ایک ٹکڑا زمین کا حصول نہیں ہے بلکہ اسے اسلام کی تجربہ گاہ بنانا ہے۔ یہ کہتے وقت نہ امیر جماعت کو یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ ہمارے بانیٔ تحریک نے اس کے خلاف کہا تھا، نہ بانیٔ تحریک کے حصے میں یہ کہنے کی سعادت آئی کہ میں نے اُس زمانے میں غلط بیانی سے کام لیا تھا، اور نہ ہی "صالحین" کی اتنی بڑی تعداد میں سے کسی نے یہ پوچھا کہ امیرِ جماعت اور بانیٔ تحریک کے بیانات میں اس قدر کھلے ہوئے تضاد کا مطلب کیا ہے؟

یہ ہے وہ جماعت جو یہاں اقامتِ دین کی مُدعی ہے۔

۴۔ اِس دور میں شاید وُہ حقیقت ہو نمودار

قرآن کریم انسانی زندگی کے غیر متبدل ابدی اصول عطا کرتا ہے اور یہ دعوےٰ کرتا ہے کہ انسانوں نے آخر الامر انہی اصولوں کو اختیار کرنا ہے۔ اگر وہ وحی کی صداقت پر ایمان لے آئیں تو ان اصولوں کے خوش گوار نتائج سے بلا تاخیر متمتع ہو جائیں گے اور اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو پھر زمانے کے تقاضے انہیں ان اصولوں کے اختیار کرنے پر مجبور کر دیں گے۔

قرآن کے ان ابدی اصولوں میں ایک اصول یہ بھی ہے کہ وسائلِ پیداوار تمام نوعِ انسان کے لئے

سامانِ رزق ہیں۔ ان پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ مفاد پرست گروہوں نے اس اصول سے انحراف برتا اور دنیا کو جہنم بنا دیا۔ لیکن زمانے کے تقاضوں نے انہیں اس طرف آنے پر مجبور کر دیا۔ پہلے اس کی آواز روس اور چین میں بلند ہوئی لیکن یورپ اور امریکہ کی سرمایہ دارانہ نظام کی حامل اقوام نے اس کی مخالفت کی۔ تھوڑا ہی عرصہ بعد حالات نے پلٹا کھایا اور یہ ممالک بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ زمین اور اس کے ذخائر کسی فرد یا قوم کی ذاتی ملکیت نہیں ہونے چاہئیں۔ انہیں تمام نوع انسان کی پرورش کے لئے کھلا رہنا چاہئے۔ یہ قومیں اس طرف آنے کے لئے کس طرح مجبور ہوئیں یہ داستان بڑی دلچسپ ہے۔

ہمارے ایک کرم فرما نے ہمیں لندن سے (FINANCIAL TIMES DAILY) کا ایک تراشہ بھیجا ہے جس میں (C.GORDON TETHER) کا ایک شذرہ درج ہے۔ اس میں اُس نے لکھا ہے کہ جب عرب ممالک نے تیل کی سپلائی بند کی تو اقوامِ متحدہ کے ایک بہت بڑے افسر (MR.MAURICE STRANG) نے مختلف ممالک کا دورہ کر کے ایک وعظ کہنا شروع کر دیا جس کا ملخص یہ ہے کہ :

> وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے اس غلط نظریہ میں تبدیلی پیدا کریں کہ زمین اور اس کے ذخائر اُس فرد یا اُس قوم کی ذاتی ملکیت ہوتے ہیں جس کے قبضے میں وہ خطۂ زمین کسی نہ کسی طرح آگیا ہو۔ زمین اور اس کے ذخائر خدا کے پیدا کردہ ہیں اور انہیں تمام نوع انسان کے انتفاع کے لئے کھُلا رہنا چاہئے۔ اس کے لئے ہمیں جہاد کرنا چاہئے۔

قطع نظر اس کے، کہ ان صاحب (یا یورپ اور امریکہ) کے اس نظریہ کے محرکات کیا ہیں، آپ دیکھئے کہ زمانے کے تقاضے کس طرح اقوامِ عالم کو کشاں کشاں اُسی منزل کی طرف لا رہے ہیں جس کی نشان دہی قرآن کریم نے چودہ سو سال پہلے کی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے انقلابِ روس کے سلسلے میں کہا تھا کہ :

انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر — کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
جو حرفِ قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک — اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

پھر انہوں نے اپنی آخری کتاب 'ارمغانِ حجاز' میں ابلیس کی زبان سے' یہ کہلوایا تھا کہ :

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآن نہیں — ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں — بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف — ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

یہ شرعِ پیغمبرؐ، بہت پہلے آشکارا ہو جاتی اگر ہماری مذہبی پیشوائیت اس پر تقدس کے پردے نہ ڈالتی رہتی۔ جہاں تک اقوامِ مہذب کا تعلق ہے، جن میں روس اور چین بھی شامل ہیں وہ زمانے کے تقاضوں سے اس نظریہ تک تو پہنچ گئیں یا پہنچ رہی ہیں کہ وسائلِ رزق پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی' لیکن ہنوز انہیں وہ بنیاد نہیں مل سکی جس پر اس انقلابی نظامِ معیشت کی عظیم عمارت استوار ہو سکتی ہے۔ یہ بنیاد انہیں اسی خدا کی کتاب سے مل سکے گی جس نے وسائلِ پیداوار کو نوعِ انسان کی عالمگیر ربوبیت کے لئے پیدا کیا ہے۔

۵۔ اسلامیات کا مضمون

پھر یہ خبر گرم ہے کہ درسگاہوں میں "اسلامیات" کو لازمی مضمون قرار دیا جا رہا ہے۔ خبر بڑی مبارک و مسعود ہے۔ کیونکہ ایک اسلامی مملکت کا اولین فریضہ ہے کہ وہ اسلام کی تعلیم کو عام کرے۔ اس سلسلہ میں بچوں کو کیا پڑھایا جائے گا اس کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔ وفاقی وزیر اطلاعات۔ اوقاف اور حج مولانا کوثر نیازی صاحب نے گذشتہ سال جمعۃ الوداع کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے جمعہ کے فضائل کے سلسلہ میں فرمایا تھا کہ:

یہی وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے انسانِ اول آدم علیہ السلام کو پیدا کیا۔ یہی وہ دن ہے جس میں انہیں جنت میں داخل کیا گیا۔ یہی وہ دن ہے جس میں انہیں جنت سے نکل کر زمین پر بسنے کا حکم ملا۔ یہی وہ دن ہے جس میں قیامت قائم ہوگی۔ اور وہ دن ہے جس میں ایک گھڑی ایسی آتی ہے کہ بندہ اس میں حرام چیز کے سوا اپنے پروردگار سے جو کچھ طلب کرے وہ اُسے عطا فرما دیتا ہے۔ (نوائے وقت۔ (۲۶) اکتوبر ۱۹۷۳ء)

طلوعِ اسلام کالج فنڈ

بہ تسلسل فہرست مطبوعہ طلوعِ اسلام بابت نومبر ۱۹۷۳ء حسب ذیل عطیات بشکریہ موصول ہوئے۔

فہرست "ب"

۱۔ محترم ظہور الدین بھٹی صاحب لاہور -/۲۵
۲۔ محترم بشیر احمد صاحب۔ ملکوال ۵۵/۰۰
۳۔ محترم عبد الکریم صاحب۔ کلر کہار چکوال -/۱۰۰
۴۔ محترم صوفی نذیر احمد صاحب۔ کویت -/۱۴۰
۵۔ محترم سید امیر حسین شاہ صاحب۔ سید حسین جہلم -/۵۰۰
۶۔ محترم علی احمد بیگ صاحب۔ لاہور -/۵
۷۔ محترم رشید بٹ صاحب۔ کراچی -/۲۰
۸۔ محترم ڈاکٹر محمد اسمٰعیل صاحب۔ چنیوٹ -/۱۰۰
۹۔ محترمہ ثریا افضل صاحبہ۔ راولپنڈی -/۳۰۱
۱۰۔ محترم عبد الرشید فاروقی صاحب۔ برمنگھم U.K. ۱۱۱/۵۰
۱۱۔ محترم نذیر حسین صاحب معرفت فاروقی صاحب۔ برمنگھم ۱۱۱/۵۰
۱۲۔ محترم محمد اعظم صاحب " " ۱۱۱/۵۰
۱۳۔ محترم عبد العزیز صاحب " " ۱۱۱/۵۰
۱۴۔ محترمہ آسیہ حمید صاحبہ۔ لنڈن کناڈا -/۳۰۰
۱۵۔ محترمہ پروین حمید معرفت " " " -/۱۲
۱۶۔ محترمہ بیگم شبیر حسین صاحبہ " " " -/۱۲
۱۷۔ محترمہ بیگم صادق صاحبہ " " " -/۶
۱۸۔ محترم محمد زمان صاحب۔ خمیس المشایط سعودی عرب -/۵۰۰
۱۹۔ محترمہ رابعہ ڈار صاحبہ۔ ایلنگ کینٹ U.K. ۲۲۳/۱۷
۲۰۔ محترم ایم لطیف صاحب۔ گلاسگو سکاٹلینڈ -/۲۴

نوٹ۔ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور کو دیئے گئے عطیات ایس۔ آر۔ او نمبر ۶۵/(K)/۴۵ مورخہ ۴/۶۵ مطبوعہ گزٹ آف پاکستان۔ پارٹ I مورخہ ۱۳/۶۵ کی رو سے انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۲۲ء سیکشن 15/D کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے۔ (سیکرٹری) قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی۔ (رجسٹرڈ) لاہور

از۔ شاہد عادل

اسلامی سربراہی کانفرنس عرب ممالک اور ہندوستان

پچھلے دنوں (فروری ۱۹۷۴ء میں) لاہور میں منعقد ہونے والی اسلامی سربراہی کانفرنس بلاشبہ ہماری حکومت کا ایک شاندار اور تاریخی کارنامہ ہے۔ اس کی کامیابی کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ حکومت کے وہ مخالفین بھی جو اس کے ہر کام میں کیڑے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کارنامے کی تعریف کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کانفرنس نے عربی ممالک سمیت تمام اسلامی دنیا میں بڑے خوشگوار اثرات چھوڑے ہیں۔ اور عرب ممالک میں اس کا ایک مثبت نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بعض عرب اہل قلم و اہل علم جو ہندوستان کے سحر انگیز پروپیگنڈے سے مرعوب ہو کر اسے بھی ایک اسلامی ملک سمجھ رہے تھے، اس کانفرنس کے ایک ہی جھٹکے سے ان کی یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔ یہی وجہ تھی کہ یہ کانفرنس ہندوستان کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔ اس لئے اندر ہی اندر اس نے اسے ناکام بنانے کی دن رات کوشش کی۔ لیکن اس کی ان مذموم خواہشوں کے علی الرغم یہ کانفرنس کامیابی سے اختتام پذیر ہوئی۔ اب ظاہر ہے کہ ہندوستان اس کے نتائج پر خاموش نہیں بیٹھ سکتا تھا کہ اس نے برسوں کی سخت محنت اور کروڑوں روپے کے اخراجات سے عرب ممالک میں اپنا جو اسلامی تشخص قائم کیا تھا وہ یوں ہواؤں میں اڑ جاتا۔ اس نے اب اس کانفرنس کے خوشگوار اثرات کو ختم کرنے کے لئے پہلے سے بھی زیادہ بھرپور کوشش شروع کر دی ہے اور عربی اخبارات کے تازہ شمارے دیکھنے سے یہ تکلیف دہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ کسی حد تک اپنی کوششوں میں کامیاب نظر آتا ہے۔ چونکہ عرب ممالک سے ہمارے تعلقات کا مسئلہ ہمارے اہم مسائل میں سے ہے اس لئے ہم اس کی صحیح نوعیت اور پس منظر کو کما حقہٗ سمجھنے کے لئے قیامِ پاکستان کے وقت سے اس پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔

قیامِ پاکستان کے وقت دنیائے عرب کے ثقافتی مرکز مصر سمیت تمام ممالک سے ہمارے تعلقات دوستانہ تھے اور ان ممالک میں ہمیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن چونکہ یہ سب کچھ ہمیں بلا محنت و کاوش مل گیا اس لئے ہم نے اس کی نہ تو قدر کی اور بعد میں ان میں جب خرابی واقع ہوئی تو نہ ہی اس کی تلافی کی کوشش کی۔ اس پاکستان دوستی کی ایک وجہ مصر کے پہلے دو سفیر محمد علی علوبہ اور ڈاکٹر عبدالوہاب عزام تھے جو قیامِ پاکستان سے بھی بہت پہلے قائداعظم سے ملاقات کا شرف حاصل کر چکے تھے۔ پھر ان حضرات کا شمار

دنیائے عرب کے جید اہلِ علم میں سے تھا۔ ان میں سے مؤخر الذکر یعنی ڈاکٹر عبد الوہاب عزام (مرحوم) درکسِ اقبال کی نسبت سے پرویز صاحب کے شاگردِ رشید تھے۔ آپ ضربِ کلیم کے عربی ترجمے کے مقدمے میں دیکھئے علامہ عزام کس اخلاص اور محبت سے پرویز صاحب کو الشیخ اور الاستاذ کہہ کر پکارتے ہیں۔ پرویز صاحب نے فکرِ اقبال کے حوالے سے ان کے دل میں پاکستان کی محبت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ ۱۹۵۱ء کے شروع میں کراچی میں ایک بین الاسلامی اقتصادی کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس میں عربوں نے پاکستان کے ساتھ جن دوستانہ جذبات کا اظہار کیا وہ ہندوستان کی برداشت سے باہر تھے۔ اس کے توڑ کے لئے اس نے عرب ممالک میں اپنے پروپیگنڈے کو منظم کرنے کے لئے ایک تحقیقی ادارہ قائم کیا۔ اس ادارے کے پروپیگنڈے کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اس کا نام ہی پُرفریب رکھا گیا۔ یعنی انڈین کلچرل کونسل۔ اس کونسل نے دو اعلیٰ پایہ کے عربی رسائل شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ ایک سہ ماہی "ثقافۃ الھند" دہلی سے' اور دوسرا پندرہ روزہ "رسالۃ المشرق" قاہرہ سے۔ سہ ماہی "ثقافۃ الھند" میں ایسے اسلامی تحقیقاتی مضامین شائع کئے گئے جن سے ہندوستان کا اسلامی تشخص ابھرتا تھا۔ اس میں مولانا ابو الکلام آزاد کی تفسیر کا عربی ترجمہ بھی شامل ہوتا تھا۔ دو عربی رسالے نجی طور پر ندوۃ العلماء لکھنؤ کی جانب سے بھی شائع ہونے لگے۔ ایک "البعث الاسلامی" اور دوسرا پندرہ روزہ "الرائد" اور پھر عرب ممالک کی کوئی لائبریری نہ تھی جہاں یہ چاروں رسائل موجود نہ ہوتے اس کے ساتھ ہی پاکستان کو گرانے کے لئے ہندوستان کے ہاتھ میں ایک اور خطرناک حربہ بھی آ گیا۔ یہ حربہ جماعتِ اسلامی پاکستان کے ذیلی ادارہ' دار العروبہ' کے ناظم مولانا مسعود عالم ندوی کے وہ ارشادات تھے۔ جن کے ذریعے' قیامِ پاکستان کے لئے جد وجہد کرنے والوں کو انگریزوں کا حاشیہ بردار اور معلوم کیا کیا ثابت کیا گیا بلکہ ان پر یہ الزام بھی لگایا کہ یہ حضرات ہر قسم کی دینی و اخلاقی قیود سے یکسر آزاد تھے[1]۔ قارئین حیران ہوں گے کہ محترم مسعود عالم ندوی کی ایسی تحریروں پر خود علمائے ہند نے بھی احتجاج کیا[2]۔ تاہم ہندوستان نے ان تحریروں کو خوب خوب اچھالا۔ ادھر اس کے پروپیگنڈے کی کامیابی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ مصر کی مشہور اسلامی جماعت' الاخوان المسلمون کے ترجمان "المسلمون" میں جو جگہ خالی بچتی تھی اسے مہاتما گاندھی کے اقوال سے پُر کیا جاتا تھا۔

حکومتِ پاکستان نے بھی اس صورتِ حالات کو محسوس کیا اور قاہرہ سے شائع ہونے والے ہندوستان کے عربی رسالے "رسالۃ الشرق" کے مقابلے میں وہیں سے معیاری رسالہ "الوعی" شائع کرنے کا بندوبست کیا۔ جس کے لئے مصر کے چوٹی کے اہلِ قلم حضرات کا "تعاون" حاصل کیا گیا۔ اس میں پاکستان اور دوسرے متعلقہ مسائل پر اعلیٰ معیاری مضامین شائع ہونے لگے۔ اور ان کے بڑے خوشگوار نتائج سامنے آنے شروع ہوتے لیکن بدقسمتی سے اسی دوران نہرِ سویز کے قومیانے اور پھر اس کے نتیجے میں جنگ کا واقعہ پیش آ گیا۔ اس بارے میں ہمارے اس وقت کے سیاست دانوں نے ایسا غلط رویہ اختیار کیا کہ دنیائے عرب کا یہ ثقافتی مرکز مصر' ہم سے سخت متنفر ہو کر ہندوستان کی گود میں چلا گیا۔ قاہرہ سے شائع ہونے والا اخبار

---

[1] ماہنامہ چراغِ راہ کراچی۔ مسعود عالم ندوی نمبر ص ۱۱۱۔ [2] ایضاً۔ ص ۵۶

عربی رسالہ بند ہوگیا۔ اور عربوں نے تو یہاں تک ناراضگی کا اظہار کیا کہ وہ کشمیر کے مسئلے میں کھلم کھلا بھارت کا ساتھ دینے لگے۔ اس کے باوجود پاکستان نے عرب ممالک سے تعلقات خوشگوار بنانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ہندوستان کے سحر انگیز پروپیگنڈے کی وجہ سے ہماری ایک نہ چل سکی۔ اس کی دوسری وجہ یہ تھی کہ جن عرب ممالک سے ہمارے دوستانہ روابط قائم تھے عالم عرب کی اکثریت انہیں اچھی نظروں سے نہیں دیکھتی تھی۔ ہاں اس تمام عرصے کے دوران سعودی عرب کے ہم سے خوشگوار تعلقات قائم رہے۔ یہ ظاہر ہے کہ بین الاقوامی حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں اور قدرت نے ۱۹۶۹ء میں پاکستان کو ایک اور سنہری موقع عطا کیا جس سے ہندوستان کے اسلامی تشخص کا بھانڈا بیچ چوراہے پھوٹ گیا۔ اس سال رباط میں پہلی اسلامی سربراہ کانفرنس میں شمولیت کے لئے اپنا وفد بھیج دیا اور بعض عرب سربراہوں کی اعانت سے کانفرنس میں گھسنے کی سر توڑ کوشش کی۔ لیکن پاکستان بڑی جرأت سے اسے دور رکھنے میں کامیاب ہوگیا جس سے ہندوستان کے وقار کو سخت دھچکا لگا۔ اس کے بعد سقوط مشرقی پاکستان کا واقعہ پیش آیا جو اگرچہ ہمارے لئے کئی لحاظ سے نہایت تکلیف دہ بلکہ دردناک تھا۔ لیکن اس کا ایک خوشگوار نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان نے عرب ممالک میں بیک پچیس سال کی محنت اور کروڑوں کے اخراجات سے اپنا جو اسلامی تشخص قائم کیا تھا وہ دھڑام سے گر گیا اور ہندوستان عربوں کے سامنے اسلام دشمنی کے اپنے اصلی روپ میں آگیا۔ یہاں تک کہ وہ عرب ممالک جن کے ساتھ غیر وابستہ ممالک کے ناطے سے ہندوستان کے نہایت قریبی تعلقات تھے وہ بھی اس سے نفرت کا اظہار کرنے لگے۔ مثلاً الجزائر جو غیر وابستہ ممالک کا گڑھ سمجھا جاتا تھا ہر سال اسلامی فکر کی ایک کانفرنس کا اہتمام بھی کرتا تھا۔ سقوط مشرقی پاکستان کے بعد اس نے ہندوستان کی بجائے اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت پاکستان کو دی۔ اور ہندوستانی حکومت کی سر توڑ کوشش کے باوجود اسے شرکت کا دعوت نامہ نہ مل سکا۔ حکومت ہند نے اس بظاہر معمولی لیکن درحقیقت اہم واقعہ کو اپنی ناکامی تصور کرتے ہوئے الجزائر سے اپنا سفیر واپس بلا لیا۔ سعودی عرب کے اخبارات میں تو ہندوستان کی وہ مٹی پلید کی گئی کہ باید و شاید۔ مثلاً وہاں کے دوسرے اخبارات کے علاوہ اخبار العالم الاسلامی کے شمارہ نمبر ۲۹۲ کے صفحہ سات پر سقوط مشرقی پاکستان کے بارے میں استاذ محمد اسد شہاب کے قلم سے پورے صفحہ پر مشتمل ایک شاندار مقالہ شائع ہوا جس میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ یہ المیہ دو اسلام دشمن طاقتوں، ہندوستان اور روس کی سازش کا نتیجہ تھا وغیرہ وغیرہ۔ ہندوستان نے اب دھکے سے ٹھہرنے کی

ہندوستان کے تین سو ساٹھ وفود

بجائے نئے سرے سے عرب ممالک میں اپنا اسلامی تشخص قائم کرنے کے لئے سر توڑ کوششیں شروع کر دیں۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ سقوط ڈھاکہ کے بعد سے لے کر لاہور میں دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس کے انعقاد کے اعلان ہونے تک ہندوستان نے عرب ممالک میں تین سو ساٹھ وفود بھیجے[لہ] اور بڑی چالاکی سے ان اہل قلم کا تعاون حاصل کیا کہ جو ہندوستان کی اسلام دشمنی کو بے نقاب کرتے رہتے تھے۔ مثلاً استاذ محمد اسد شہاب جنہوں نے

[لہ] روزنامہ نوائے وقت - لاہور، بابت ۲۶ نومبر ۱۹۷۳ء۔ صفحہ ۴

ہندوستان کے خلاف اپنے قلم کا پورا زور صرف کر دیا تھا۔ ہندوستان ان کا تعاون حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا اور پھر استاد موصوف نے اسی اخبار یعنی اخبار العالم الاسلامی کے دو پرچے دو شماروں میں ہندوستان کے اسلامی تشخص کو یوں ابھارا گویا وہ دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔[۱] اسی دوران موجودہ حکومت کے مخالفین نے بھی عرب ممالک میں کچھ ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جس سے اگرچہ وہ موجودہ حکومت کو عرب لوں کی نظروں میں گرانا چاہتے تھے لیکن اس کا زیادہ نقصان خود پاکستان کو پہنچا۔

پاکستان میں کمیونسٹ نواز حکومت؟

قارئین کو یاد ہو گا کہ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کی تحریک کے دوران اسلامی نظام کے نام نہاد علمبرداروں نے شوکتِ اسلام ڈے منایا اور عرب ممالک خصوصاً سعودی عرب میں اس کا خوب پراپیگنڈہ کیا گیا۔ مثلاً ایک طرف یہ مشہور کیا گیا کہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو ملک میں بائیں بازو یعنی کمیونسٹ حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اور دوسری طرف یہ پروپیگنڈا کیا کہ صدر یحییٰ ملک کو اسلامی آئین دینے والے ہیں۔ اور پھر سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کا ایک لمبا چوڑا بیان اس کی تائید میں شائع ہوا۔[۲] تاہم برسرِ اقتدار آنے کے بعد وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے عرب ممالک کا جو طوفانی دورہ کیا اس سے اس جھوٹے پراپیگنڈہ کے پیدا کردہ نقوش بڑی حد تک مدھم پڑ گئے۔ لیکن اب مخالفین نے اس سے بھی زیادہ خطرناک حربہ استعمال کیا اور دین کو اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کیا وہ یوں کہ وزیرِ اعظم بھٹو جو اس وقت صدرِ پاکستان تھے کے بارے میں یہ جھوٹ مشہور کیا گیا کہ وہ "قادیانی" ہیں۔ علمائے اسلام کے ایک بین الاقوامی اجتماع میں سعودی عرب کے ایک مشہور عالمِ دین ڈاکٹر محمد علوی مالکی جو سلطان عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ میں پروفیسر ہیں، اور تونس کے زیتونیہ کالج کے پروفیسر السید الشاذلی بالقاضی نے مجھ سے بڑے رازدارانہ لہجے میں دریافت کیا کہ کیا واقعی صدر بھٹو قادیانی ہیں۔ اس سوال نے مجھے چونکا دیا اور میں نے فی الفور تردید کی۔ اس جھوٹ کی قلعی کھول دینے کے لئے میں نے یہ وضاحت کی کہ قادیانی ہمارے ملک میں بمشکل ایک یا دو فیصد ہیں جبکہ صدر بھٹو کو عوام کی اکثریت نے منتخب کیا ہے۔ میری اس وضاحت سے وہ حضرات اور دوسرے نمائندے بڑے خوش ہوئے۔ چونکہ یہ معاملہ بڑا سنگین نوعیت کا تھا میں نے ایک رپورٹ کے ذریعے حکومت کی توجہ بھی اس طرف دلائی اور کچھ واقف وزرا صاحبان کو بھی اس کی کاپیاں ارسال کیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس جھوٹے پروپیگنڈے کو ختم کرنے کی پوری کوشش نہ کی گئی۔ ہندوستان تو ایسے مواقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے اس جھوٹے پراپیگنڈے کو بڑی کامیابی سے اچھالا۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ہمارے عرب بھائیوں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ افغانستان اور پاکستان کے تنازعہ کا اصلی سبب یہی مسئلہ قادیانیت ہے۔ وہ اس طرح کہ افغانستان نے ایک خالص اسلامی ملک ہونے کی بنا پر کچھ قادیانیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا تھا جسے پاکستان نے ابھی تک معاف

---

[۱] العالم الاسلامی مکۃ المکرمہ شمارہ نمبر ۳۰۳ صفحہ ۷، ۸ اور نمبر ۳۰۵ صفحہ ۸، ۹۔ [۲] ماہنامہ رابطۃ العالم الاسلامی مکۃ المکرمہ بابت فروری ۱۹۷۰ء صفحہ ۸۲۔ [۳] ماہنامہ دعوۃ الحق رباط مراکش بابت اکتوبر ۱۹۷۱ء صفحہ ۱۵۲

نہیں کیا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ اگر صدر (اور اب وزیراعظم) پاکستان کو قادیانی ثابت نہیں کیا جا سکا تو کم از کم حکومت پاکستان کو "قادیانی نواز" مشہور کر دیا جائے۔ عرب ممالک میں اتنے سے شر انگیز پراپیگنڈے سے بھی پاکستان کے متعلق جو تاثر پیدا ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

حالیہ عرب اسرائیل جنگ اور ہندوستان

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ سقوط ڈھاکہ کے بعد عرب ممالک میں تین سو ساٹھ وفود بھیج کر ہندوستان نے ایک دفعہ پھر عرب ممالک میں کسی حد تک اپنا اسلامی تشخص قائم کر لیا تھا۔ انہی دنوں چوتھی عرب اسرائیل جنگ شروع ہو گئی اور ہندوستان نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے ہندوستانی اہل علم کو عرب ممالک بھیجنے کی سہولت بہم پہنچائی جہاں انہوں نے عربوں کی حمایت میں بڑے لمبے چوڑے بیانات دیئے جنہیں عرب اخبارات میں شہ سرخیوں سے شائع کیا گیا۔ اس وقت ہمارے سامنے ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سیکرٹری جنرل مولانا ابوالحسن علی ندوی کا وہ مضمون ہے جو اخبار العالم الاسلامی مکہ مکرمہ سمیت بہت سے عربی اخبارات میں شائع ہوا۔ اور جسے محاذ جنگ کی تازہ ترین تصاویر سے مزین کیا گیا ہے[۷]۔ اس مضمون میں ہندوستان کے مسلمانوں کی جانب سے عربوں کو ہر قسم کی مدد کی پیشکش کی گئی تھی۔ ہندوستان کے مسلمان لیڈروں کے یہ بیانات نہ صرف عربی اخبارات میں شائع ہوئے بلکہ انہیں ریڈیو اور ٹیلیویژن سے بھی شائع کیا گیا جس سے ہندوستان عربوں کے دل میں یہ احساس اجاگر کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ ان کا مخلص دوست ہے۔ اور جیسا کہ ان واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے روزنامہ نوائے وقت کے نمائندہ بیروت نے اس تلخ حقیقت کا ذکر کیا ہے اس عرصے میں عرب پریس میں پاکستان کا نام تو کجا پاکستان کی دیرینہ ہمدردیوں کا بھی کوئی ذکر نہ تھا[۸]۔

یہی نہیں بلکہ اس کے برعکس عرب اسرائیل جنگ میں ایران اور پاکستان کے رول کا مذاق اڑایا گیا[۹]۔ بیروت سے روزنامہ نوائے وقت کے نمائندہ خصوصی جناب سہیل اقبال نے بھی کچھ اسی قسم کی رپورٹ بھیجی۔ فرماتے ہیں:

> مشرق وسطےٰ کی حالیہ جنگ کے دوران پاکستان کے رول پر اندرون عرب حلقوں میں شدید تنقید ہوئی ہے۔ عرب پریس نے ایسے تبصرے اور نوٹ شائع کئے ہیں جس سے پاکستان کا وقار بے حد مجروح ہوا ہے[۱۰]۔

رابطۃ العالم الاسلامی کے وفود

انہی دنوں دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے حالات وغیرہ معلوم کرنے کے لئے رابطۃ العالم الاسلامی

---

[۷] اخبار العالم الاسلامی عدد ۳۵۷ صفحہ ۳۔ [۸] روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۶ نومبر ۱۹۷۳ء۔ صفحہ ۴۔

[۹] مجلۃ الاسبوع العربی۔ بیروت۔ ۵ نومبر ۱۹۷۳ء۔

[۱۰] روزنامہ نوائے وقت۔ لاہور۔ بابت ۳ دسمبر ۱۹۷۳ء۔ صفحہ ۴

مکہ مکرمہ کی جانب سے کئی وفود بھیجے گئے۔ ان وفود کی ترتیب ہندوستان کی خواہشات کے عین مطابق تھی۔ مثلاً ایسے ممالک کہ جن سے پاکستان کے تعلقات دوستانہ تھے وہاں کے وفد کی قیادت ہندوستان کی مشہور علمی شخصیت مولانا ابوالحسن علی ندوی کے سپرد کی گئی جن کا صرف نام ہی ہندوستان کے پروپیگنڈے کے لئے کافی تھا اور جو وفد ہندوستان یا اس کے ہم خیال ممالک کی جانب بھیجا گیا اس کی قیادت ملائشیا کے ایک اہلِ علم' جو تنکو عبدالرحمٰن کے دستِ راست تھے، کر رہے تھے۔ ان تمام وفود میں پاکستان کا کوئی رکن شامل نہ تھا۔ اور قارئین اس حقیقت سے بے خبر نہ ہوں گے کہ ایک اسلامی ملک ہونے کے باوجود ملائشیا کا جھکاؤ ہندوستان کی طرف ہے۔ اس لئے اس وفد نے جو رپورٹ دی اور جو اخبار العالم الاسلامی مکہ مکرمہ کے دو شماروں ۳۵۴ اور ۳۵۵ میں شامل ہوئی۔ اس سے ہندوستان کا اسلامی تشخص ایک دفعہ پھر ابھر آیا۔ یہاں تک کہ شاہ فیصل' کہ جن کے دل میں پاکستان کے ساتھ گہری وابستگی ہے' وہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ رائے ہم نے اس لئے قائم کی ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو اخبار العالم الاسلامی میں ہندوستان کے اسلامی تشخص کے بارے میں اتنی مفصل رپورٹ کبھی شائع نہ ہوتی۔ اس کے علاوہ کچھ اور واقعات بھی اس طرف ہماری راہنمائی کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک اہم واقعہ سعودی عرب کے دارالخلافہ ریاض میں نوجوانوں کی ایک عالمی کانفرنس تھی جو ۲۳ دسمبر ۱۹۷۳ء کو منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے انعقاد سے کافی عرصہ پہلے پاکستان میں دوسری سربراہی کانفرنس بلانے کا اعلان ہو چکا تھا۔ لیکن نوجوانوں کی اس عالمی کانفرنس میں حکومتِ پاکستان کو سرکاری طور پر مدعو کرنے کی بجائے پاکستان سے جماعتِ اسلامی کے پروفیسر خورشید عالم صاحب کو دعوت نامہ بھیجا گیا۔ یہ صاحب اب پھر رابطۃ العالم الاسلامی کی اس کانفرنس میں شرکت کے لئے مکہ شریف پہنچ چکے ہیں جو ۶ر اپریل کو شروع ہوئی ہے۔ اس بات کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے اس واقعہ کو ایک دفعہ پھر ذہن میں لائیے کہ الجزائر نے اسلامی فکر کی کانفرنس میں ہندوستان کو مدعو نہیں کیا تھا۔ اس طرح ہندوستان نے ایک دفعہ پھر عرب ممالک میں اپنے اسلامی تشخص کو ابھار کر نہ صرف شاہ فیصل کو متاثر کیا بلکہ کانفرنس کے خوشگوار نتائج پر بھی اپنا اثر ڈالنے میں کسی حد تک کامیاب ہو گیا۔ چالیس ممالک کی یہ سربراہی کانفرنس کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا اور اسلام اور پاکستان کے دشمن جس کی آخری دم تک مخالفت کرتے رہے۔ لیکن یہ اس شاندار طریقے سے منعقد ہوئی جس سے معاندین کو روسیاہی نصیب ہوئی۔ اس کانفرنس کی کامیابی کا سہرا وزیر اعظم پاکستان (مسٹر بھٹو) کے سر تھا۔ لیکن عرب اخبارات میں جس طرح اس کارنامے کا ذکر ہوا اس سے دل کو بڑا رنج ہوا۔ اور حیرانی کی بات یہ تھی کہ یہ عرب اخبار نویس وہ تھے جنہیں کانفرنس کے موقعہ پر خصوصی طور پر بلایا گیا تھا اور جو پاکستان کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ مثلاً انہی اخبار نویسوں میں سے ایک صاحب' محمد محمود حافظ تھے جو سعودی عرب کے مشہور اخبار " الاخبار العالم الاسلامی" کے چیف ایڈیٹر ہیں اور سعودی عرب میں کافی اثر و رسوخ رکھتے ہیں۔ انہوں نے کانفرنس سے واپسی پر اپنے اخبار کے شمارہ نمبر ۳۶۷ بابت ۴ر مارچ ۱۹۷۴ء میں

ہندوستان کے اسلامی تشخص کا سربراہ کانفرنس پر اثر

کانفرنس کے بارے میں جو تفصیلات شائع کیں ان میں مسٹر بھٹو کے بیان کو صرف ایک کالم میں یا دو تین انچ جگہ دی گئی جبکہ دوسرے سربراہوں کے بیانات کو علیحدہ دو دو کالمی سرخیوں کے ساتھ زیادہ جگہ کا مستحق قرار دیا گیا۔ حتیٰ کہ مودودی صاحب کے بیان کو بھی وزیر اعظم کے بیان کی نسبت دوگنی جگہ اور دو کالمی سرخی کا حقدار قرار دیا گیا"[1]

عرب ممالک کے ساتھ پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات کے بارے میں یہ سلسلے نشیب و فراز ہم نے اس لئے بیان کئے ہیں تاکہ آئندہ کے لئے ہم احتیاط سے کام لیں اور زیادہ نہیں تو کم از کم اتنا تو کریں جتنا اس سلسلے میں ہندوستان کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں کرنے کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ عرب ممالک

عرب ممالک میں اہلِ علم کے وفود بھیجنے کی ضرورت

کے بارے میں ایک تحقیقاتی ادارہ فوری طور پر قائم کیا جائے۔ اس بارے میں اپنی تجویز پیش کرنے سے پہلے راقم ہندوستان کے ایسے ہی ادارے یعنی انڈین کلچرل کونسل کی کارکردگی کی ایک جھلک دکھاتا ہے۔ تاکہ ہمیں اس کی ضرورت کا احساس ہو۔ پچھلے دو سال میں ہندوستان کے جن تین سو ساٹھ وفود کا ہم ذکر کر چکے ہیں وہ اعلیٰ سیاسی شخصیتوں پر مشتمل نہ تھے بلکہ زیادہ تر غیر مشہور لیکن علمی شخصیتوں پر مشتمل تھے۔ اس مقصد کے لئے عام طور پر ان اہلِ علم کو بھیجا جاتا ہے جن کا عرب ممالک کے بارے میں کوئی تحقیقی کام شائع ہو چکا ہو۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ اہلِ علم اس سلسلے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس اول تو ہمارے ہاں اس قسم کا کوئی ادارہ نہیں۔ ادھر عرب ممالک میں مختلف وفود بھیجتے وقت اس امر کا خیال نہیں رکھا جاتا کہ ان حضرات نے عرب ممالک کے بارے میں کیا تحقیقی خدمات سرانجام دی ہیں۔ اس لئے اس سلسلے میں اس کام کے اہل' اہلِ علم میں کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوتی۔ اس بارے میں اگر ہم اپنے ملک کے ایک وفد کی مثال پیش کریں تو بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔ پچھلے سال لیبیا میں نوجوانانِ عالم کی ایک شاندار عالمی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں پاکستان سے بھی سات آٹھ ممبروں کا ایک سرکاری وفد شریک ہوا تھا۔ ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ ان حضرات کو عربی زبان پر کس حد تک دسترس حاصل تھی لیکن یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ان میں سے کسی صاحب کا عرب ممالک کے بارے میں کوئی تحقیقی کام تو کجا کوئی معمولی سا مضمون بھی نظر سے نہ گزرا۔ اس لئے نتیجہ ظاہر ہے۔ اس کانفرنس کا افتتاح لیبیا کے سربراہِ مملکت کرنل معمر القذافی نے کیا تھا۔ اور انہوں نے اپنی اس افتتاحی تقریر میں پورے انیس مقامات پر "تیسری دنیا کے نظریئے" کی تشریح کی تھی۔ خیال رہے کہ کرنل قذافی اپنے آپ کو تیسری دنیا کے نظریئے کے بانیوں میں شمار کرتے ہیں اور اس کی بنیاد قرآن مجید پر رکھتے ہیں۔ اپنے ایک کتابچہ "حول أسس النظرية العالمية الثالية" میں اس کی تائید میں انہوں نے پوری

---

[1] اخبار العلم الاسلامی شمارہ نمبر ۲۶۷ صفحہ ۵۔

تینتیس ۳۳ آیاتِ قرآنی پیش کی ہیں۔ لیکن اس کانفرنس کے شرکاء نے وطن واپس آکر کرنل قذافی کے اس نظریے کا ان کے حوالے سے تعارف تک نہ کرایا۔ حالانکہ ذرائع ابلاغ اس وفد کے نمائندے کے اپنے ہاتھوں میں تھے۔ اب دیکھیے اس غفلت کا ملک و قوم کے لئے کیسا نقصان رساں نتیجہ نکلا۔ مثلاً اسلامی سربراہی کانفرنس کے بعد وزیرِ اعظم بھٹو نے تیسری دنیا کا نام لیا تو مخالفوں نے شور مچا دیا کہ یہ نظریہ تو ہندوستان اور روس کے ذہن کی پیداوار ہے اور پاکستان کے وجود کے خلاف سازش ہے۔ عام مخالفین کو تو جانے دیجئے، ہمارے ملک کے مشہور کالم نویس جناب مرغوب صدیقی صاحب نے بھی روزنامہ نوائے وقت کی تین مسلسل اشاعتوں[12] میں یہی ثابت کیا کہ یہ نظریہ روس اور بھارت کی ملی بھگت کا نتیجہ ہے اور یہ کہ پاکستان میں روس اور بھارت کی لابی اس کا پرچار کر کے اسلامی اتحاد کو کمزور کرنے کی کوشش میں لگی ہے۔ ہمارے ملک کے اس صفِ اول کے کالم نویس نے تو یہاں تک فرما دیا کہ کرنل عمر قذافی اس نظریے کے جانی دشمن ہیں۔ اس لئے اگر انہوں نے ہماری زبان سے اس اصطلاح کو سن لیا تو ہمارے ملک سے ان کے تعلقات بگڑنے کا خطرہ ہے۔ اندازہ لگائیے کہ اگر کرنل عمر القذافی کے اس نظریے کی بروقت وضاحت ہو جاتی تو نہ حکومت کو پریشان ہونا پڑتا اور نہ مخالفین کو نعرے لگانے پڑتے اور نہ ہی ہمارے صفِ اول کے کالم کو غلط معلومات کی بنا پر غلط نتائج نکالنے پڑتے۔

جدید ڈپلومیسی کا استعمال

انڈین کلچرل کونسل صرف مناسب وفود بھیجنے پر ہی اکتفا نہیں کرتی۔ وہ جدید ڈپلومیسی کا ہر حربہ استعمال کرتی ہے۔ مثلاً اس ڈپلومیسی کا ایک حربہ یہ ہے کہ جس ملک میں اثر و رسوخ بڑھانا ہو اس کی کسی خصوصیت کو چاہے وہ کتنی ناقص کیوں نہ ہو، آسمان پر چڑھایا جائے۔ پھر اس خصوصیت پر "ریسرچ" کے لئے اہلِ علم کو بھیجا جاتا ہے جن کا تعلق دفترِ خارجہ سے ہوتا ہے۔ وہ اپنی ریسرچ کے ذریعے ایک تو متعلقہ ملک کو بے وقوف بناتے ہیں اور دوسرے ان امور پر نظر رکھتے ہیں جن کے طفیل اپنے ملک کے لئے مقبولیت کا راستہ نکالا جاتا ہے (خود ہمیں بھی بعض ممالک نے خوب بے وقوف بنایا۔ وہ یوں کہ انہوں نے اپنے اہلِ علم کو ہمارے ایک کارنامے یعنی "بنیادی جمہوریت" پر ریسرچ کے لئے بھیجا جس سے ہم خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے) ہندوستان نے سعودی عربیہ میں جدید ڈپلومیسی کا یہ حربہ استعمال کر کے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا حالانکہ کونسی ایسی اسلامی چیز ہے جس پر بھارت کو ریسرچ کی ضرورت لاحق ہو! لیکن اس نے اس تحقیق کے پروگرام کے پردے میں بہت سے اہلِ علم کو وہاں بھیج کر اپنا مقصد حاصل کیا۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔ سعودی عربیہ کے حکمران مدینہ یونیورسٹی کو اپنا قابلِ فخر کارنامہ سمجھتے ہیں۔ ویسے بھی وہاں نوے ممالک کے دو ہزار طالب علم اسلامی تعلیم حاصل کرتے ہیں جن میں سے اکثر کا تعلق اپنے اپنے ملک کی وزارتِ خارجہ سے ہوتا ہے۔ ہندوستان نے اس یونیورسٹی کے نظامِ تعلیم کے مطالعہ کے لئے اپنے کئی اہلِ علم بھیجے۔ ان کی رپورٹ کی روشنی میں بھارت

---

[12] روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۷، ۲۸ اور ۲۹ مارچ ۱۹۷۴ء

نے سعودی عرب سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اپنی خطوط پر ہندوستان میں ایک اسلامی یونیورسٹی قائم کرنا چاہتا ہے (حالانکہ اپنی دنوں وہ مسلمانوں کی قدیم اسلامی یونیورسٹی علی گڑھ کا اسلامی تشخص ختم کرنے کے درپے تھا) چنانچہ بھارت کی اس "خواہش" سے سعودی عرب کے حکمرانوں کو جس قدر خوشی ہوئی اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے بھارت کے شہر بنارس میں ایسی یونیورسٹی کے قیام کے نہ صرف تمام مصارف برداشت کئے بلکہ اب اسے سالانہ گرانٹ بھی دی جا رہی ہے! اور پھر ہندوستان نے بڑی ہوشیاری سے تمام عرب پریس میں اس خبر کو شائع کرا کے اپنا مطلب حاصل کیا۔

عرب ممالک کے بارے میں تحقیقی ادارے کی ضرورت

ہماری ان گزارشات سے قارئین نے یہ محسوس کیا ہوگا کہ عربوں سے گہرے دینی، ثقافتی، سیاسی اور اب اقتصادی تعلقات کی بنا پر ہمارے ہاں ایک ایسے ادارے کی اشد ضرورت ہے جو ان ممالک کے بارے میں تحقیقی کام سرانجام دے۔ امریکہ میں اس وقت ایسے چار درجن ادارے موجود ہیں۔ اور جیسا کہ راقم پہلے عرض کر چکا ہے ہمارے ملک میں ایک بھی ایسا ادارہ نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے ادارے پر کافی اخراجات اٹھنے کا امکان ہو اور فی الحال ہمارے پاس مناسب وسائل موجود نہ ہوں تو اس بارے میں بھی راقم ایک تجویز پیش کرتا ہے جس پر عمل کرنے سے اتنے اہم ادارے کے قیام کے لئے ایک پیسہ زائد خرچ کرنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ وہ یوں کہ ہمارے ملک میں اسلامی تحقیقات کے لئے دو ادارے ہیں۔ ایک ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد، اور دوسرا ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور۔ ان میں سے کسی ایک کو آسانی سے عرب ممالک کے تحقیقی ادارے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی سیکرٹریٹ سے پورا فائدہ اُٹھانے کی ضرورت

ماضی میں ہم نے اسلامی سیکرٹریٹ سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، بلکہ اس کے برعکس تنکو عبدالرحمٰن کی موجودگی کی وجہ سے الٹا ہندوستان نے اس ادارے سے فائدہ اٹھایا، حالانکہ وہ اس کا ممبر تک نہ تھا۔ یہ بڑی تکلیف دہ بات تھی کہ اسلامی سیکرٹریٹ کا سابق سیکرٹری جنرل پاکستان کی بھرپور تائید سے اس عہدے پر پہنچا، لیکن اس کے باوجود اس نے پاکستان کے مفاد کے خلاف کام کیا۔ یہاں تک کہ اسلامی سیکرٹریٹ کے اعلیٰ عہدوں میں سے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی جو آسامی پاکستان کے لئے مخصوص کی گئی تھی اس نے اس پر حکومتِ پاکستان کے منتخب کردہ افسر کو تعینات کرنے کے بجائے یہ عہدہ ایک ایسے "پاکستانی" کے حوالے کر دیا جو مدتوں پہلے پاکستانی شہریت کو خیرباد کہہ کر لندن میں آباد ہو چکا تھا اور اس کے اکثر رشتہ دار ہندوستان میں تھے۔ اس تقرر کی وجہ سے کسی پاکستانی کو درجہ دوم، سوم بلکہ چہارم تک کا کوئی عہدہ نہ مل سکا حالانکہ ہندوستان ایسے ہی غیر اہم عہدے داروں کی معرفت اپنے بڑے بڑے مقاصد حاصل کرتا ہے۔ خوش قسمتی سے اب اسلامی سیکرٹریٹ کے نئے سیکرٹری جناب حسن التہامی نے چارج سنبھال لیا ہے۔ اس لئے حکومت کو کوشش کر کے اسلامی سیکرٹریٹ میں اپنا ایک ایسا افسر پہنچانا چاہیئے جو عربی زبان پر کامل دسترس رکھتا ہو

(باقی صفحہ ۷۲)

تاکہ وہ مختلف کوائف سے حکومت کو مطلع کرتا رہے۔ ویسے بھی سعودی عرب بین الاقوامی اسلامی مرکز ہے ہمیں وہاں ایسا انتظام کرنا چاہیئے کہ اسلام کے حوالے سے جو بھی بین الاقوامی نوعیت کے معاملات وہاں سرانجام پائیں حکومت کو ان کی پوری خبر ہو۔ خاص طور پر اس بارے میں ہندوستان کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

حرفِ آخر

ہماری ان گزارشات سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ اسلامی سربراہی کانفرنس کے شاندار کارنامے کے بعد ہمیں مطمئن ہو کر بیٹھ نہیں رہنا چاہیئے۔ بلکہ اس کے خوشگوار نتائج کو مؤثر بنانے کے لئے عرب ممالک میں پہلے سے بھی زیادہ سرگرم جدوجہد کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر جبکہ ہمارا دشمن ہندوستان اس کے اثرات کو کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اگر ہماری ان گزارشات کو درخورِ اعتنا سمجھا گیا تو ان پر عمل کرنے سے ملک و ملت کے لئے مفید نتائج برآمد ہوں گے۔

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور میں
ہر اتوار - صبح ۸ ½
بمقام
۲۵/بی گلبرگ نمبر ۲ - لاہور
ٹیلیفون نمبر ۸۰۰۸۰

لائلپور میں
بروز جمعہ - (بذریعہ ٹیپ)
۲ ½ بجے - بعد نماز جمعہ
بمقام: دفتر بزمِ طلوعِ اسلام
رادھا چوک - ریل بازار - لائلپور
رابطہ کے لئے - ٹیلیفون نمبر ۲۴۹۴

ملتان میں
بروز جمعہ - (بذریعہ ٹیپ)
بعد نماز جمعہ
بمقام: دفتر شاہ سنز
بیرون پاک گیٹ ملتان
ٹیلیفون نمبر ۲۰۷۱

سیالکوٹ میں
ہر اتوار صبح ۸ ½ بجے (بذریعہ ٹیپ)
بمقام چوہدری محمد دین کی شال
کریکن ٹاؤن سیالکوٹ نمبر ۲

کراچی میں
ہر اتوار - صبح ۹ ½ بجے - (بذریعہ ٹیپ)
بمقام: دفتر بزمِ طلوعِ اسلام - دارالقائد B-I-20
بس سٹاپ نمبر ۷ - ناظم آباد نمبر ۱/۱۱ - کراچی نمبر ۱۸

کوئٹہ میں
ہر اتوار - ۳ ½ بجے بعد دوپہر
(بذریعہ ٹیپ)
بمقام: ۳ گوردت سنگھ روڈ
فون نمبر ۷۷۷۷ کوئٹہ

راولپنڈی میں
ہر جمعہ: ۴ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ)
بمقام: جی ۱۹۴ - لیاقت روڈ
راولپنڈی

واہ میں
ہر جمعہ - بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ)
بمقام: ۱۵ جہلم روڈ
واہ (WAH)

بابُ المراسلات

تحریفِ سُنّت کا الزام

پرویز صاحب کے نام ایک خط :

تحریفِ قرآن کے موضوع پر آپ نے طلوعِ اسلام کے دو پرچوں میں جو کچھ لکھا ہے اور پیغامِ صلح نے اس کا جو جواب لکھا تھا انہیں میں نے بڑی توجہ سے پڑھا ہے۔ مارچ کے رسالہ میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس کا جواب ابھی تک کہیں سے نہیں دیا گیا۔ اور میرا خیال ہے کہ اس کا معقول جواب کسی سے بن ہی نہیں پڑے گا۔ ویسے لکھنے کو تو ہر شخص کچھ نہ کچھ لکھ سکتا ہے جس کے ہاتھ میں قلم ہو اور چھاپنے کے لئے کوئی اخبار۔ یہ عریضہ آپ کی توجہ ایک اور بات کی طرف منعطف کرانے کے لئے لکھ رہا ہوں۔ لاہور سے ایک ماہنامہ شائع ہوتا ہے جس کا نام ہے 'رفتارِ زمانہ' اور جس کے ایڈیٹر ہیں 'مبارک احمد خان۔ (غالباً ان کا تعلق قادیانی جماعت سے ہے)۔ اس ماہنامہ کی اشاعت بابت فروری ۱۹۷۴ء میں پہلے صفحہ پر جلی سرخیوں کے ساتھ آپ کے خلاف "تحریفِ سنتِ نبویؐ" کا الزام لگایا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ آپ اپنے خطابات میں عام طور پر السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ کی بجائے 'سلام و رحمت' کہتے ہیں اور یہ سنتِ نبویؐ کی تحریف ہے۔ اس خط کو پیغامِ صلح نے اپنی ۲۷ مارچ ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں بھی شائع کیا ہے۔ گویا ان کے نزدیک بھی یہ الزام بڑا وقیع ہے۔ کیا آپ نے ان اخبارات میں اس خط کو دیکھا۔

پرویز صاحب کا جواب

جی ہاں! میں نے ان اخبارات میں اس خط کو دیکھا ہے طلوعِ اسلام بابت جنوری ۱۹۷۴ء میں میرے مضمون کی اشاعت کے بعد محترم مبارک احمد خاں صاحب نے یہ خط مجھے ذاتی طور پر لکھا تھا۔ ۱۲ فروری کو میں نے اس کا جو جواب ان کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔ اس کی نقل تو میرے پاس نہیں۔ اس کا ملخص یہ ہے کہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ کی بجائے 'سلام و رحمت' کہنا ' ایسا ہی ہے جیسا ہم خطوط کی ابتدا میں عام طور پر ۷۸۶ لکھتے ہیں - یہ ابجد کے حساب سے قائم مقام ہوتا ہے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کا۔ اسے آج تک کسی نے تحریفِ سنت قرار نہیں دیا۔ "سلام و رحمت" مخفف ہے السلام علیکم و رحمۃ اللہ کا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے تحریفِ سنت کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔ بایں ہمہ اگر میری اتنی سی بات بھی حرف گیری کا موجب قرار پا سکتی ہے تو میں آئندہ مخفف کی بجائے پورے الفاظ لکھ دیا کروں گا۔

یہ تھا وہ جواب جو میں نے ان صاحب کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔ اب ان حضرات کی دیانت کا یہ عالم ہے کہ یہ اپنے خط کو شائع کر رہے ہیں لیکن میرے جواب کا کہیں ذکر تک نہیں کرتے۔ اور اپنا خط بھی اس طرح شائع کر رہے ہیں گویا یہ ایک کھلی چٹھی ہے جو مجھے مخاطب کر کے اخبارات میں شائع کی جا رہی ہے نہ کہ ایک ایسے خط کی نقل' جو مجھے نجی طور پر لکھا گیا تھا۔ اگر وہ اس کی صراحت کر دیتے تو لوگ یقیناً ان سے پوچھتے کہ کیا پرویز صاحب نے اس کا کوئی جواب بھی دیا تھا۔ اور اس کے جواب میں انہیں حقیقت بیان کرنی پڑتی۔

میں تو اکثر حیران ہوتا ہوں کہ ہم کس دور سے گزر رہے ہیں اور ہمارا واسطہ کس قسم کے لوگوں سے پڑتا ہے؟ اصل سوال کا جواب ان کے پاس کچھ تھا نہیں اس لئے لوگوں کی توجہ کا رُخ دوسری طرف موڑنے کے لئے "پرویز صاحب" کے خلاف 'تحریفِ سنت' کا الزام عائد کر دیا! یہ ان حضرات کا شروع سے وطیرہ چلا آ رہا ہے۔

۲- قرآن میں تحریف

لائلپور سے ایک صاحب پرویز صاحب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ آپ نے طلوعِ اسلام کی دو اشاعتوں میں قرآن میں تحریف کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس نے مجھے چونکا کر رکھ دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ بڑا اہم ہے اس لئے اس کے متعلق بڑی تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے' بالخصوص اس امر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہ اس قسم کی سازش کی ابتدا کہاں سے ہوئی۔ یہ کس طرح آگے پھیلی اور آج تک کس طرح تسلیم ہوتی چلی آئی۔ شیعہ صاحبان کے متعلق تو علم رکھتا تھا کہ وہ موجودہ قرآن مجید کو محرف قرار دیتے ہیں لیکن سُنیوں کے ہاں مختلف قرأتوں کا عقیدہ خود تحریف کو تسلیم کرتا ہے۔ درخواست ہے کہ آپ ان امور پر تفصیل سے لکھیں۔ یہ اسلام کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

طلوع اسلام

پرویز صاحب نے ان مسائل کے متعلق اپنی کتاب "شاہکار رسالت' عمر فاروق رضی ____ میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ اُس کے پہلے حصے میں تو یہ بتایا گیا ہے کہ نظری اعتبار سے صحیح اسلامی نظام کیا ہے۔ اور وہ

حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں کس طرح عمل میں آیا - اسلامی نظام زندگی کو نظری اور عملی اعتبار سے سمجھنے کے لئے کتاب کا وہ حصہ بڑا مفید ہے۔ اس کے دوسرے حصے میں (یعنی کتاب کے آخری باب میں جو قریب ایک سو صفحات پر مشتمل ہے) یہ بتایا گیا ہے کہ وہ نظام اپنی اصلی شکل میں قائم کیوں نہ رہا اور اس کے بعد وہ دین، رفتہ رفتہ' اس مذہب میں کس طرح تبدیل ہو گیا جو اب ہمارے ہاں مروج ہے۔ اس میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے عقائد' نظریات اور مسالک کے متعلق تفصیلی بحث کی گئی ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ عقائد و نظریات کہاں سے آئے اور کس طرح اسلام کا جزو بن گئے۔ تحریف فی القرآن کا موضوع بھی اس کے اندر موجود ہے اور ختم نبوت کی مہر کو توڑنے کی مختلف سازشوں کا تذکرہ بھی اس اعتبار سے یہ کتاب بڑی جامع حیثیت رکھتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے ملک میں بڑی مقبولیت حاصل کی ہے۔

۳- انگلستان میں مخلوط تعلیم

گذشتہ چند ماہ سے مجھے انگلستان میں مقیم پاکستانی دوستوں کی طرف سے ایک ہی موضوع پر خطوط موصول ہو رہے ہیں۔ میں نے انفرادی طور پر، ان خطوط کے جواب دیئے لیکن اب انہوں نے کہا ہے کہ اس مسئلہ نے وہاں بڑی اہمیت اختیار کر لی ہے، جس کے لئے ضروری ہے کہ میں طلوع اسلام میں اس کے متعلق کچھ لکھوں تاکہ یہ وضاحت وہاں کے احباب کے سامنے بیک وقت آجائے۔ مسئلہ یہ ہے کہ انگلستان میں تعلیم مخلوط ہے۔ پاکستانی مسلمانوں کو (اور دیگر ملکوں کے مسلمانوں کو بھی) جو وہاں ایک عرصہ سے مقیم ہیں اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے انہی درس گاہوں میں بھیجنا پڑتا ہے۔ چھوٹی عمر تک تو خیر' لیکن لڑکیوں کے بڑی عمر پر پہنچنے کے بعد یہ سوال غور طلب اور پریشان کن بن جاتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ پہلے تو یہ سوال انفرادی تھا۔ لیکن اب وہاں اس نے اجتماعی شکل اختیار کر لی ہے اور مخالف اور موافق پارٹیاں بن گئی ہیں جن میں اس سوال پر بحث و جدل شروع ہو گئی ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم اسلامی نقطۂ نگاہ سے جائز ہے یا نہیں۔ یہ ہے وہ سوال جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ میں طلوع اسلام میں ذرا وضاحت سے لکھوں۔

سوال مخلوط اور جداگانہ تعلیم کا نہیں۔ اصل سوال جوان لڑکوں اور لڑکیوں کے اس قسم کے اختلاط سے پیدا ہونے والے نتائج کا ہے۔ قرآن کریم' مردوں اور عورتوں (جن میں جوان لڑکے اور لڑکیاں بدرجۂ اولیٰ شامل ہیں) کی عصمت اور عفت پر بڑا زور دیتا ہے۔ وہ اسے ایک مستقل قدر قرار دیتا ہے جس کی حفاظت نہایت ضروری ہے۔ اس کے برعکس' انگلستان میں جنسیات کے مسئلے کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی یہاں تک کہ وہاں کسی جوان لڑکے اور لڑکی کے (شادی کے بغیر) باہمی رضامندی سے جنسی اختلاط تک کو بھی نہ معاشرتی بد اخلاقی تصور کیا جاتا ہے نہ قانونی جرم۔ میری قرآنی بصیرت کے مطابق' مردوں اور عورتوں کا ملنا جلنا ناجائز نہیں' لیکن جس میل جول کے نتیجہ میں' عفت و عصمت کی قدر پر زد پڑنے کا احتمال ہو' اُس سے احتراز ضروری ہے۔ قرآن کریم اُن اسباب کو روکتا ہے' جو کسی غلط اقدام کی طرف لے جانے کا موجب

بن سکتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب انگلستان میں جنسیات کے متعلق، اخلاقی، معاشرتی اور قانونی نقطۂ نگاہ وہ ہو جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، تو اس ماحول میں جوان لڑکے اور لڑکیوں کا بے محابا، مجلسی اختلاط —— خواہ وہ سکولوں اور کالجوں کی درسگاہوں ہی میں کیوں نہ ہو —— قرآنی نقطۂ نگاہ سے ناپسندیدہ بلکہ ناجائز اقدامات تک کا موجب بن سکتا ہے۔ اسلام تو خیر، بہت آگے کی بات ہے۔ ہمارے عام مشرقی گھرانوں میں بھی اس قسم کے اختلاط کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا، اور ایسے (ULTRA-MODERN) گھرانوں کے) اُن لڑکیوں کے لئے موزوں رشتے ملنے مشکل ہو جاتے ہیں، جن کے متعلق کہا جائے کہ ان کا جوان لڑکوں سے میل جول ہے، خواہ یہ میل جول محض رسمی قسم کا بھی کیوں نہ ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ جو والدین اپنی لڑکیوں کے سلسلے میں اس قسم کے ممکن نتائج یا احتمالات کو پسند نہ کرتے ہوں اور انہیں تعلیم بھی دلانا چاہتے ہوں، (جس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا) وہ انگلستانی معاشرے میں کیا کریں؟ ظاہر ہے کہ اس مسئلے کا حل، انفرادی طور پر نہیں ہو سکتا۔ یہ اجتماعی سوال ہے اور اس کا حل بھی اجتماعی جد و جہد ہی سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ انگلستان میں پاکستانی مسلمان لاکھوں کی تعداد میں بستے ہیں اور وہاں بعض شہر ایسے بھی ہیں جہاں ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ اگر کوشش کریں تو حکومت کے قواعد و ضوابط کے مطابق اپنے جُداگانہ سکول اور کالج کھول سکتے ہیں۔ اگر وہاں کے موجودہ ضوابط میں اس کی گنجائش نہ ہو تو خصوصی حالات کی روشنی میں، ان میں اس قسم کی استثناء کرائی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کے لئے ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستانی ہائی کمشنر مقیم انگلستان کی تائید، حمایت اور تعاون کی ضرورت ہوگی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کا کس حد تک امکان ہے۔

کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے، کہ وہاں بسنے والے مسلمانوں میں سے بعض نے ہمیں لکھا کہ وہاں حلال گوشت حاصل کرنے میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔ ان حالات میں کیا کیا جائے؟ میں نے انہیں لکھا تھا کہ آپ حضرات وہاں ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ حکومت سے اجازت لے کر اپنے مذبح کا انتظام کیوں نہیں کر لیتے۔ جب یہودیوں نے اس کے لئے اپنا جُداگانہ انتظام کر رکھا ہے تو وہاں کے مسلمان ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے پاکستانی ہائی کمشنر کی طرف رجوع کرنا چاہئے، کیونکہ یہ ایک اجتماعی ضرورت اور دینی تقاضا ہے۔ اس پر بعض دوستوں نے لکھا تھا کہ ہائی کمشنر کے حضرات اس مسئلے میں معاونت کرنے کے لئے آمادہ نہیں۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ اگر وہاں اس قسم کے مسائل اور مشکلات کے سلسلے میں ہائی کمشنر کی طرف اجتماعی طور پر رجوع کیا جائے اور خود حکومتِ پاکستان کی توجہ بھی اس طرف منعطف کرائی جائے تو ان کی طرف سے حمایت اور معاونت کیوں نہ ہو اور حکومتِ انگلستان کی طرف سے جُداگانہ درسگاہوں کی اجازت کیوں نہ مل سکے؟

لیکن اس مقام پر پہنچ کر معاً یہ خیال سامنے آجاتا ہے کہ حکومتِ انگلستان اس قسم کی درخواست کو یہ کہہ کر مسترد نہ کر دے کہ خود مملکتِ اسلامیہ پاکستان میں (کم از کم) یونیورسٹی کی سطح پر مخلوط تعلیم ہے۔ اگر یہ وہاں قابلِ اعتراض نہیں تو اسے یہاں کیوں قابلِ اعتراض قرار دیا جاتا ہے؟

ظاہر ہے کہ اس کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہو سکتا!　　(پرویز)

محمد شاہد

تعلیمی اداروں سے عربی ختم کرنے کی مذموم کوشش کا خاتمہ ہونا چاہیئے

اسلامی سربراہی کانفرنس کے نتیجے میں ہمارے ملک میں عربی زبان کی اہمیت جس طرح اجاگر ہوئی ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج بچے، جوان اور بوڑھے سب اس کی تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند نظر آتے ہیں اور بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ خود حکومت نے بھی اس کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے تعلیمی اداروں سے باہر، یعنی پاکستان نیشنل سنٹروں میں اس کی تدریس کا انتظام شروع کر دیا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حقیقت حکومت کے علم میں نہیں کہ کس طرح ایک خاص سازش کے تحت عربی زبان کو تعلیمی اداروں سے رفتہ رفتہ ختم کیا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ اسلامیات جیسے مضمون، کہ جس کے لئے عربی زبان کا علم ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے، سے بھی اسے خارج کر دیا گیا ہے۔

قارئین اس انکشاف پر شاید حیران ہوں کہ کیا عربی زبان کے بغیر بھی اسلامیات کی تعلیم ممکن ہے تو ان کی خدمت میں عرض ہے کہ اصولاً تو ایسا ممکن نہیں لیکن عملاً اس وقت ہمارے ملک کے اعلےٰ تعلیمی اداروں میں اسلامیات کی تدریس عربی زبان کے بغیر ہو رہی ہے۔ دراصل اس کی چند ایک وجوہات ہیں۔ کچھ لوگ اسلامیات کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے اور یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا تھا جب تک عربی زبان کو اسلامیات سے خارج نہ کر دیا جائے اور چونکہ یہ حضرات اپنے آپ کو اسلامی نظام کے علمبرداروں کی صورت میں پیش کرتے تھے۔ اس لئے عربی زبان کو ختم کرنے کی جس سازش پر عمل کیا گیا اس کی کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب قیام پاکستان کے بعد پنجاب یونیورسٹی میں علوم اسلامیہ کا شعبہ قائم کیا گیا تو بنیادی طور پر یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ایم۔ اے اسلامیات کا ایک پرچہ عربی زبان پر مشتمل ہو گا۔ اور یہ کہ اس امتحان میں شرکت کرنے والوں کے لئے یہ بھی ضروری ہو گا کہ انہوں نے بی۔ اے تک عربی پڑھی ہو یا اس کے برابر کوئی دوسرا امتحان پاس کیا ہو۔ ایم۔ اے اسلامیات کے لئے یہ دونوں شرائط نہایت مناسب تھیں، کیونکہ اس کے طفیل اسلامیات کی اعلےٰ تعلیم حاصل کرنے والے طالب علم اس قابل ہو سکتے تھے کہ وہ اسلام کے قدیم علمی سرمایہ سے براہ راست استفادہ کر سکیں لیکن بدقسمتی

سے جن لوگوں نے نصاب کی تفصیلات طے کیں انہیں خود عربی زبان پر دسترس حاصل نہ تھی۔ اس لئے جب نصاب سامنے آیا تو اس سے عربی زبان کا مخصوص پرچہ غائب تھا۔ تاہم اس کے لئے دوسری شرط یعنی بی۔ اے تک عربی کی تعلیم حاصل کرنا موجود تھی۔ پھر یہ نصاب کچھ اس طرح ترتیب دیا گیا کہ اس کے لئے عربی زبان کی کسی اصل کتاب کی سرے سے مطالعہ کی ضرورت ہی نہ رہی بلکہ اس کی بجائے زیادہ تر مودودی صاحب کی اُردو کتابیں کام دینے لگیں اور طلبا کو اس کی ترغیب یوں دی گئی کہ شعبہ اسلامیات کے اُس زمانے کے سربراہ نے خود مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن کی طلبا کے سامنے اس انداز میں تعریف کی کہ ان طلباء کو کسی دوسری طرف دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی اور اس طرح ایم۔ اے اسلامیات کا امتحان جماعت اسلامی کی کتابوں کے ذریعے پاس کیا جانے لگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ عربی زبان کو اسلامیات سے نکال دینے پر جماعت اسلامی کی طرف سے کسی احتجاج کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس صورتِ حال کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ اسلامیات کے نوجوان طالب علم مودودی صاحب کے خیالات سے متاثر ہوں۔ چنانچہ یہی کچھ ہوا۔ پھر یہی نوجوان اسلامیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے کالجوں میں لیکچرار مقرر ہوئے اور اس طرح تعلیمی اداروں میں اسلامیات کے شعبے جماعت اسلامی کے اڈوں میں تبدیل ہونے شروع ہو گئے۔ تاہم ابھی تک ایم۔ اے اسلامیات کے لئے بی۔ اے میں عربی کا مضمون لینے کی شرط ان شعبوں کے پوری طرح جماعتِ اسلامی کے اڈوں میں تبدیل ہونے میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی کیونکہ اس کی وجہ سے اکا دکا طالب علموں میں عربی زبان کا ذوق پیدا ہو جاتا تھا جس کی وجہ سے وہ اسلامی علوم کی تحقیقات میں دلچسپی لینے لگتے اور براہ راست قدیم اسلامی لٹریچر سے استفادہ کرتے جس کی وجہ سے وہ مودودی صاحب کی تحقیقات سے اختلاف کرنے لگتے۔ اس لئے موقع ملتے ہی اسلامیات کی اعلیٰ تعلیم کے لئے بی۔ اے میں عربی والی شرط بھی ختم کر دی گئی کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ چنانچہ اس کے بعد اسلامیات کے شعبے مکمل طور پر جماعتِ اسلامی کے اڈے بن گئے اور عوام چاہے اس جماعت کو ووٹ دیں یا نہ دیں وہ ان اڈوں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتی رہتی ہے۔ پھر ان اڈوں کی وجہ سے جماعت کا اثر و رسوخ صرف اسلامیات کے شعبوں تک محدود نہ رہا بلکہ اسلام اسلام کا نام لینے کی وجہ سے دوسرے شعبوں کا متاثر ہونا بھی ضروری تھا۔ ادھر جماعت کا اثر و رسوخ اس قدر بڑھا کہ کالجوں میں اسلامیات کا نصاب انہی کی خواہش کے مطابق مرتب ہو گیا۔ یہاں تک کہ بی۔ اے کے نصاب سے قرآن مجید کا ایک حصہ خارج کر کے اپنی ایک کتاب اسلامی نظریہ حیات داخل نصاب کروا دی جو ایک طرح سے جماعتِ اسلامی کے پورے لٹریچر کا خلاصہ ہے۔ حالانکہ اگر کوئی دوسرا قرآن مجید کے ساتھ یہ سلوک کرتا تو اس کے خلاف اتنا زہریلا پروپیگنڈہ کیا جاتا کہ اس بچارے کو جان بچانی مشکل ہو جاتی۔

جن واقعات کی ہم نے تفصیل بیان کی ہے۔ یہ کوئی راز نہیں ہیں بلکہ تعلیمی اداروں سے معمولی سا

طلوعِ اسلام کنونشن۔ نومبر ۱۹۷۳ء

قسط (۱)

مجلسِ مذاکرہ

منعقدہ ۲۴ر نومبر ۱۹۷۳ء بروز ہفتہ

موضوع — "نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے"

صدارت — نشست اول — محترمہ بیگم رضا علی

نشست دوم — محترمہ ثریا عندلیب

شرکائے مذاکرہ

۱۔ سلمٰی لطیف۔ (آٹھویں جماعت کی طالبہ)
۲۔ اعجاز احمد۔ (جماعت ہشتم از جہلواں)
۳۔ صالحہ شغفی۔ (سال دوم)
۴۔ راحیل اکبر۔ (سال دوم)
۵۔ ثریا عندلیب۔
۶۔ شہباز مرزا۔ (طالب علم۔ بی۔ ایس۔ سی)
۷۔ تحیہ فاروقی (طالبہ۔ بی۔ اے)
۸۔ محمد احمد۔ (ایل۔ ایل۔ بی)
۹۔ مقبول الٰہی۔ (بی۔ ایڈ۔ ٹیچر)
۱۰۔ مسز رضا علی۔ (کراچی)
۱۱۔ خالد سلام۔ (پروفیسر)
۱۲۔ طاہرہ حیدر۔ (ایم۔ ایس۔ سی)
۱۳۔ گوگی۔ (چھٹی جماعت)
۱۴۔ رانی۔ (تیسری جماعت)
۱۵۔ خلیل احمد۔ (بی۔ اے۔ سیالکوٹ)
۱۶۔ محمد نذیر خٹک (ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ۔ مردان)
۱۷۔ شاہدہ منظور۔ (ایم۔ اے۔ گجرات)
۱۸۔ شوکت پرویز (سال دوم)
۱۹۔ غلام صابر (ایم۔ اے)
۲۰۔ عارفی سلطانہ (ایم۔ اے)
۲۱۔ نجمہ صفدر علی۔ (بی۔ اے)
۲۲۔ سلمٰی پرویز۔ (ایم۔ اے)

(۱)

سلیے لطیف

بزرگانِ من !

اس دفعہ باوجود انتہائی کوشش کے میں اپنے آپ کو موضوع کے حق میں بولنے پر آمادہ نہ کر سکی چنانچہ میں نے
لہ کیا کہ اس دفعہ خدا کرے میں حصہ نہ لوں گی۔ لیکن بعد میں میں نے سوچا کہ جس غزل کا مقطع سلیے پر تیز
اس کا مطلع بھی سلیے ہی ہونا چاہئیے چاہے وہ سلیے لطیف ہی کیوں نہ ہو!

آپ کو یاد ہوگا بزرگانِ من! چند سال پہلے اسی کٹہرے میں کھڑا کر کے آپ نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں
دں زندہ رہنا چاہتی ہوں؟ بات کوئی مشکل نہ تھی کہ زندہ رہنے کا مطلب تھا یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کی دی
ی ہدایات کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ میرا یہ جواب آپ کے لیے وجہ طمانیت ہوا۔ اور آپ نے فرمایا۔

آثار بتانے ہیں سحر ہو کے رہے گی۔

جب میں نے پوچھا کہ وہ سحر کب ہوگی تو آپ نے فرمایا کہ یہ سحر خود بخود نہ ہوگی۔ سحر کی تمنا ہے تو

نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر!

ت یہ بھی میری سمجھ سے بالاتر نہ تھی۔ زندہ رہنا ہے تو زندگی کا اہتمام بہرحال کرنا ہی ہوگا۔ مگر آپ نے کہا
ہیں زندگی اتنی آسان نہیں۔

جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

میں نے کہا۔ بالآخر میں ایک انسان ہوں اور وہ کونسی بات ہے جو انسان کے لئے ناممکن ہے۔ لیکن
ں بھی آپ نے میری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اور کہا کہ

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ہ کا فرمانا میرے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں نے اسی اسٹیج پر اپنا مطالبہ دہراتے ہوئے کہا
کہ آپ ہمیں ایک قرآنی درس گاہ دیجئے ہم غالب کو جھٹلا کے دکھا دیں گے۔ بجائے اس کے کہ آپ میری گذارشات
ور فرماتے، آپ نے اسے چھوٹا منہ اور بڑی بات گردانتے ہوئے فتوےٰ صادر فرما دیا کہ

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

ا کے بعد بزرگانِ من! ہمارا خیال تھا کہ آپ ان ناپختہ فکروں کی تربیت کا اہتمام کرنے کی فکر میں ہونگے۔
پورا سال ہم نے یہ مژدہ جانفزا سننے کے انتظار میں گذارا کہ اگلے سال جب آپ یہاں تشریف لائینگے
پ کہیں گے لو بچیو! یہ ہے تمہاری قرآنی درس گاہ۔ یہ ہے تمہارے خوابوں کی تعبیر۔ تمہاری مشکلات
عل۔ آؤ کہ یہ درس گاہ تمہاری منتظر ہے۔ مگر وائے قسمت کہ دس سال کے مسلسل انتظار کے بعد بھی
ا پیغام ملتا ہے تو فقط یہ کہ " نہ ہو نومید۔ نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے " اب آپ ہی بتائیے کہ
گانِ من! کہ آپ ۱۹۶۲ء میں یہ فرما رہے ہیں کہ " آثار بتاتے ہیں سحر ہو کے رہے گی "۔ میں آپ سے

۱۹۷۳ء میں یہ پوچھتی ہوں ۔۔

کب ہوگا سویرا کوئی اسے کاش بتائے ۔۔ کب ہوگا سویرا

میں نے جو یہ کہا ہے اسے نا امیدی سے تعبیر نہ کیجئے۔ یہ شدتِ تمنا ہے۔ یہ بیتابیٔ شوق ہے۔ اسلئے میں نے آپ سے جواب مانگا ہے۔ مایوس جواب نہیں مانگا کرتے۔

—— (۱) ——

(۲)

اعجاز احمد

محترمہ صدر صاحبہ، معزز حاضرین اور باباجی!

السلام علیکم۔ میں آج پہلی دفعہ فکر قرآنی کی مجلس میں شامل ہو رہا ہوں۔ میں کھیلوال سے اپنے لئے علیحدہ مضمون لکھ کر لایا تھا جس کا عنوان تھا "دین و مذہب میری نظر میں"۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ عنوان تو اور ہے جس پر مجھے کچھ کہنا ہے۔ وہ عنوان کیا ہے۔ وہ ہے "نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے" صاحب۔ مجھے یہ عنوان بھی قبول ہے۔ لیجئے سنیئے۔

یہ کہنے کو تو علامہ اقبال کا ایک شعر ہے۔ لیکن مومن کے لئے قرآن کریم کی ایک دعوت ہے جو پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ مایوس و نا امید ہونا تیرا خاصہ نہیں۔

نا امیدی تو اس وقت آتی ہے جب انسانی زندگی میں توازن اور اعتدال ٹوٹ جائے۔ پھر یہ عدم توازن اور بے اعتدالی۔ انفرادیت سے نکل کر اجتماعی زندگی میں داخل ہو جاتی ہے۔ انفرادیت سے گروہ۔ گروہ سے قوم اور قوم سے ملت اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔

اب میں اس کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

جب میں ایک کارخانہ دار کی حیثیت سے، شام کو اپنے ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر ۔/۲۰۰۰ روپے منافع گنتا ہوں۔ اور مزدوروں کے سامنے جنہوں نے اس کو کمایا ہے ۲½ فیصد زکوٰۃ ادا کر کے اس کے جائز ہونے کا اعلان کرتا ہوں تو ان کے سینوں سے ایک آہ نکلتی ہے جو میری خوشگوار اور رنگین فضا کو چیرتی ہوئی مایوسیوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

جب میرے جھگی نشین پڑوسی حسد بھری نظروں سے، میرے عالی شان محل کے بلند میناروں کو دیکھ کر سرگوشیاں کرتے ہیں۔ تو مجھے توازن ٹوٹتا صاف دکھائی دیتا ہے۔ میرے ذہن میں ایک نفسیاتی الجھن جنم لیتی ہے اور میرے ہر طرف نا امیدی اور مایوسی بکھیر دیتی ہے۔

جب میں لا الٰہ الا اللہ کے پردہ میں ایک اسلامی ملک تو حاصل کر لیتا ہوں مگر نظام خداوندی کو اصل شکل میں یہاں رائج نہیں کرتا تو مایوسی اور نا امیدی کا تاریک سایہ میری تمام قوم پر پڑ جاتا ہے۔

جب میں نے ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے قوم کو روٹی، کپڑا اور مکان کا حسین اور دلفریب وعدہ تو کر لیا۔ لیکن صدر اور وزیر اعظم بن کر بھی اس کے پورا کرنے سے قاصر رہا تو زندہ باد کے نعرے میرے

لئے مرثیہ بن کر سامنے آتے۔

میرے بزرگو! آپ نے دیکھ لیا کہ کس طرح میری مختلف شکلیں میرے لئے نا اُمیدی اور مایوسی لا رہی ہیں۔ اور میری یہ غلط روش کیسے میرے لئے بے یقینی اور تذبذب پیدا کر رہی ہے۔

باباجی! یہ سب کچھ میرے ساتھ اس لئے ہو رہا تھا کہ میں اپنے آپ کو مسلمان سمجھ رہا تھا۔ خالص پیدائشی مسلمان۔ اب میں آپ کے پاس پہنچ گیا ہوں۔ میں نے آپ کی تحریر پڑھ لی ہے۔ میں قرآن کو سمجھ گیا ہوں۔ اس مومنین کی جماعت کے سامنے۔ ایک آزاد فضا میں ہوش و حواس قائم رکھتے ہوئے ایمان لاتا ہوں۔ آپ کے سامنے بیعت کرتا ہوں۔ کسی پیر کے ہاتھ پر نہیں جس کے سامنے مریدین کی بے بسی صاف عیاں ہو۔ میری بیعت تو نظامِ خداوندی پر ہے۔ لاریب فیہ کی کتاب پر ہے جو مجھے توازن اور اعتدال بخشے گی۔ جو مجھے اپنی ضروریاتِ زندگی کا تعین کر کے، باقی دولت نسلِ انسانی کی پرورش کے لئے کھلا چھوڑ دینے کے لئے کہیگی۔ اب میں ایرکنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر شام کو ۷۰۰/- روپے منافع نہیں گنوں گا۔ اب میرے محل کے ساتھ جھگی نشینوں کا محل تیار ہوگا۔ اب میرا یہ نظامِ خداوندی عملی شکل میں میرے ملک میں نافذ ہوگا۔ اب میں برملا کہہ سکتا ہوں کہ واقعی میرا خدا سب سے بڑا ہے۔ میرا رسول رسولوں کا رسول ہے۔ میری کتاب سب سے بڑا ضابطۂ حیات ہے۔ اب میں بھی سب سے بڑا ہوں۔ اب میں ایک ایسے مقام پر ہوں، جس میں نہ بے یقینی اور تذبذب ہے اور نہ کوئی نفسیاتی الجھن۔"

اب میں جاعلٌ فی الارض سے خلیفہ ہوں۔ معراجِ انسانیت میرا مسکن ہے۔ بہشت و دوزخ میرے سامنے ہیں۔ موت اپنی ناامیدیوں کو ساتھ لئے میرے سامنے سر جھکائے کھڑی ہے۔ میں اس کو کہہ رہا ہوں۔ یہ میرے خدا کی سلطنت ہے۔ یہ میری سلطنت ہے۔ یہاں میرے خدا کا قانون نافذ ہے۔ جاؤ اپنی ناامیدیوں کو لے کر میری سلطنت سے نکل جاؤ۔ میرے لئے کوئی موت نہیں۔ میں زندہ ہوں۔ زندہ رہوں گا۔ جب حساب لینے والے فرشتے میرے سامنے آئینگے میں ان کو واضح کر دوں گا کہ میرا حساب مثقال ذرۃٍ خیراً یرہ و مثقال ذرۃٍ شراً یرہ۔ کی رو سے ادا کر دیا۔ جاؤ میری پرواز مت روکو۔ اب میرا اپولو آرم سٹرانگ کے اپولو سے زیادہ تیز ہے۔ اور میں آسمانوں پر کمندیں ڈال رہا ہوں۔

کیوں باباجی! ایسی حالت میں۔ میں ناامید ہو سکتا ہوں۔

——— (۰) ———

(۳)

صالحہ نخمی

صدرِ محترم اور حاضرینِ گرامی۔ السلام علیکم۔

آج کی اس بلند پایہ اور دعوتِ غور و فکر دینے والی مجلس میں میں بھی اپنی چھوٹی سی سوچ و فکر اور امید کی امنگ کا دیا جلانے آپ کے سامنے حاضر ہوں اور اس سلسلے میں سب سے پہلے محترم و مشفق باباجی کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنہوں نے مجھے آپ سب کے سامنے اظہارِ خیال کرنے کا موقعہ عنایت فرمایا۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں آج کے مذاکرے کو وہ جانبخش اور حرارت افروز عنوان دیا گیا ہے کہ جس سے زندگی و بیداری کی کرنیں پھوٹتی نظر آتی ہیں۔ یہ عنوان علامہ اقبال کا فرمان ہے کہ ؎ "نہ ہو نومید نومیدی زوال علم و عرفان ہے" اگرچہ یہ چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی تاہم میں سمجھتی ہوں کہ علامہ اقبال کے اس زندۂ جاوید قول میں ہر انسان کے لئے سیدھی اور متوازن زندگی گزارنے کا راز پوشیدہ ہے۔ آپ دیکھئے کہ زندگی اور امید کا ساتھ انسان کے اس دنیا میں قدم رکھتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ جب نومولود بچہ قانونِ قدرت کے مطابق اپنی زندگی کی بقا کے لئے ماں کی گود میں اپنی اس غذا کی طرف لپکتا ہے جو قدرت نے اس کے لئے مقرر کر دی ہے۔ پھر وہ جوں جوں بڑا ہوتا ہے اور اپنے قدموں پر چلنا شروع کر دیتا ہے اس کے اندر آگے بڑھنے کی اور نئی نئی باتیں معلوم کرنے کی آرزو اور جستجو پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح شعور کی حدود میں داخل ہونے پر زندہ و بیدار انسان وہی کہلاتا ہے جو اپنے دل میں امید کی جوت جگاتا ہے۔ اپنی تعمیری قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہناتا ہے اور علم و عرفان کے خزانوں سے اپنا دامن بھرتا چلا جاتا ہے۔ اس کے برعکس مایوسی و ناامیدی کے گرداب میں پھنسا ہوا مردہ دل انسان نہ صرف خود علم و بصیرت سے محروم رہتا ہے بلکہ اپنے معاشرے میں بھی افسردگی و پژمردگی پھیلانے کا موجب بنتا ہے۔ اس کی واضح مثال ہمارا آج کا اپنا معاشرہ ہے جہاں ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھے رہنے والے اور آہیں بھر بھر کر وقت گزارنے والے افراد نے یاس و ناامیدی کا ایک ایسا چکر چلا رکھا ہے کہ آس و امید کی کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ہر طرف اضطراب و خلفشار [illegible] بھی ہوتی ہے اور کوئی بندۂ خدا ذرا رک کر یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ زندگی کا وجود رکھتے ہوئے ناامیدی کیسی اور مایوسی کیوں؟ زندگی تو حرکت و حرارت کا دوسرا نام ہے اور حرکت و حرارت امید و آرزو کے بغیر پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ امید کی عدم موجودگی سے ایک سرد سکوت باقی رہ جاتا ہے جو زندگی نہیں موت کی علامت ہے۔

پھر یہ بھی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ علم و عرفان کی عمارت امید و عزم کی بنیاد پر ہی استوار ہو سکتی ہے۔ جو شخص امید و یقین سے اپنا دل خالی رکھتا ہے بھلا وہ اُسے علم و عرفان کی روشنی سے کیونکر منور کر سکتا ہے؟ اسی لئے حضرت اقبال نے ناامیدی کو ایسی لعنت سے تعبیر کیا ہے جو علم و عرفان کی نعمت کو انسان سے چھین لیتی ہے اور پھر اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ علم و عرفان کے زوال سے انسانیت کو کبھی کمال حاصل نہیں ہوتا۔ مایوسی تو وہ دیمک ہے جو قوم کی عملی و تخلیقی قوتوں کو اندر ہی اندر چاٹ کر جاتی ہے اور ایسی کھوکھلی قوم زندہ کہلانے کی مستحق نہیں رہتی بلکہ اس کا شمار مردہ قوموں میں ہی ہوتا ہے۔

انسانی زندگی کا تجربہ اور مشاہدہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ اپنی زندگی کا مقصد حاصل کرنے کے لئے [illegible] ہو، دل میں لگن ہو، محنت کرنے کا حوصلہ، عزم و استقلال، جذبۂ ایثار و قربانی اور سب سے بڑھ کر اپنا مقصد پالینے کی امید دل میں ہو تو راہ کی تمام مشکلات پر قابو پا کر منزل پر پہنچا جا سکتا ہے۔ کامیابی صرف ان لوگوں کے قدم چومتی ہے جن کا ارادہ اٹل ہو، جو ناکامی سے نہ گھبرائیں اور مصائب سے نہ ہچکچائیں، بلکہ مشکلات [illegible] عزائم اور بھی مضبوط کر دیں۔ جو عزم اٹھائیں لیکن خود میں آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی پائیں ؎ طائرِ دل کیلئے غم شہپرِ پرواز ہے

تاریخ عالم پر نظر دوڑائیں تو بیسیوں ایسے انسانوں کی مثالیں سامنے آجائیں گی جنہوں نے اپنی زندگیوں کے مختلف ادوار میں مختلف مصائب برداشت کئے لیکن امید کو مایوسی پر حاوی رکھا اور آخر کار اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے اور زندگی کے امتحان میں سرخرو ہو کر نکلے۔ سرور کائنات حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم اور دنیا کے کئی عظیم لیڈر مثلاً سر سید احمد خان، ان کے علاوہ دنیا کے بیسیوں عظیم سائنس دان عزم و ہمت اور امید کی ایسی چٹانیں ثابت ہوئے جن کے سامنے آنے والی مصیبتیں اور آفتیں ان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئیں۔ حضرت قائد اعظم محمد علی جناح جن کی بے پناہ کاوشوں کے نتیجے میں آج ہم اپنے آزاد وطن پاکستان کی فضا میں سانس لیتے ہیں۔ وہ بھی اپنے عظیم مقصد میں لگن، عمل اور امید ہی کی بدولت کامیاب ہوئے۔ بقول اقبال ؎ کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی۔ یہ حقیقت ہے کہ قائد اعظم اپنی جدوجہد کے ایک مرحلے پر مسلمانوں کی نااتفاقی کی وجہ سے اپنی منزل سے ناامید ہو گئے تھے اور انگلستان تشریف لے گئے۔ لیکن جب علامہ اقبال نے انہیں ہمت و حوصلہ دلایا تو وہ ایک نئے عزم اور ولولے کے ساتھ ہندوستان واپس آ کر علم و عرفان کی روشنی میں دوبارہ جدوجہد اور کوشش میں مصروف ہو گئے۔

اس دنیا میں بسنے والے انسانوں پر آزمائشوں کے کڑے ادوار آیا ہی کرتے ہیں۔ ماضی قریب میں دنیا میں بنگلہ دیش کا قائم ہو جانا اس کی نمایاں مثال ہے جب ہندوؤں اور غدار مسلمانوں کی سازشوں اور ملی بھگت نے ہمارے پیارے وطن پاکستان کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اور مشرقی پاکستان کی مقدس سرزمین پر بنگلہ دیش کا پرچم لہرا دیا۔ ہزار ہا مسلمان مجاہدوں اور شہریوں کو بھارت کے نظر بندی کیمپوں میں گوناگوں تکالیف جھیلنے پر مجبور کر دیا اور ان کے عزیزوں اور رشتہ داروں کو اپنے رفیقوں سے جدائی کے عالم میں زندہ درگور کر دیا۔ ہمارا ملک دنیا بھر کی نظروں میں ذلیل ہو گیا اور ہزار سال سے مسلمانوں کی محکوم ہندو قوم نے ہم پر فتح حاصل کر لی۔ محب وطن پاکستانیوں کے لئے یہ ایک صدمۂ عظیم تھا جس نے ان کے دلوں میں ناامیدی و مایوسی کی تاریکیاں پھیلا دیں۔ ان کے دلوں کو ایک ایسا دھچکا لگا جس نے ان کی سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب کر لیں اور وہ یہ بھول گئے کہ یاس و ناامیدی کے اندھیرے غاروں میں بھٹکنے کی بجائے اگر پاکستانی اب بھی مل جل کر عمل اور کوشش کریں تو دنیا کے نقشے پر ایک درخشندہ قوم کی حیثیت سے ابھر سکتے ہیں۔ اور معاشرتی، تہذیبی اور معاشی طور پر کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔ اس مقصد کو پانے کے لئے انہیں علامہ اقبال کے اس پیغام پر عمل پیرا ہونا چاہیئے۔

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ — پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

ہمارے اذہان پر علم و عرفان کے نقوش جو واضح نہیں ہیں اور ہم یاس کی دھند کی لپیٹ میں جو آئے ہوئے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم پر اپنی زندگی کا مقصد واضح نہیں۔ ہم اپنی ذات کو پہچاننے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اگر ہم اپنی خودی کو پہچان لیں تو ہم پر زندگی کے اسرار و رموز آشکارا ہو جائیں۔ ہم پر زندگی کے وجود کا مقصد واضح ہو جائے اور ہم اپنی ذات میں مخفی صلاحیتوں کی نشوونما کر کے اس مقصد کو پانے کی جدوجہد میں مصروف ہو جائیں۔

علامہ اقبال نے اپنے حیات بخش اور حرارت افروز اشعار میں ہمیں کامیاب زندگی گزارنے کے لئے عمل اور جدوجہد کا پیغام دیا ہے۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

جس قوم کو اس قسم کی شمشیریں میسر آجائیں وہ مایوس کیوں ہو!

ہمارے پاس خدا کی وہ لاثانی کتاب موجود ہے جو ہمیں قدم قدم پر امید کی روشنی اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کی راہ دکھاتی ہے۔ اس کے باوجود ہمارا اپنے حال اور مستقبل سے مایوس ہو جانا اور دل شکن ہو کر بے زار و بیکار ہو کر بیٹھ جانا ہمیں کہاں تک زیب دیتا ہے؟ کیا ہمیں نعوذ باللہ قرآن حکیم پر اعتماد نہیں رہا؟ اس کا ہم زبان سے ہزار انکار کریں، ہمارے اعمال سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔ جب ہمارے اعمال خدا کے احکام کے مطابق نہیں رہے تو ہمارا ان پر زبانی ایمان کیا وزن رکھتا ہے؟ جب تک ہم عقل و فکر سے کام لیتے ہوئے، دل و دماغ کی پوری رضامندی کے ساتھ قرآنی احکام کو قبول کر کے ان پر عمل پیرا نہیں ہوں گے ہم زندگی میں سرخرو نہیں ہو سکتے۔ اپنی راہ میں آنے والی مشکلات پر قابو نہیں پا سکتے۔ ناامیدی کے شیطانی چنگل سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ (باقی باقی)

پرویز صاحب کی معرکہ آراء انگریزی کتاب

ISLAM : A CHALLENGE TO RELIGION

جس نے اپنے ملک کے علاوہ یورپ اور امریکہ کے اربابِ فکر و نظر سے بھی خراجِ تحسین حاصل کیا ہے۔

قیمت :- (بکس بورڈ کور) -/۲۰ روپے } محصول ڈاک اور پیکنگ علاوہ
قیمت :- (خوبصورت جلد کے ساتھ) -/۳۰ روپے }

جلد حاصل کیجئے
ناظم

کراچی میں ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات

حاصل کرنے کے لئے

دفتر بزم طلوع اسلام کراچی سے رابطہ قائم کریں ——— ٹیلیفون ۶۱۰۴۶۸

پتہ :- دار القائد - 20-1-B - III ناظم آباد - کراچی ۱۸

بزمہائے طلوع اسلام "تعارف تحریک طلوع اسلام" کے سلسلے میں مواد بھیجنے کے لئے مذکورہ صدر پتہ دفتر بزم کراچی کا نوٹ کر لیں اور آئندہ نمائندہ صاحب کے گھر کے پتہ پر کوئی چیز نہ بھیجی جائے۔

(بقیہ تعلیمی اداروں سے عربی)

تعلق رکھنے والے حضرات بھی اس سے اچھی طرح واقف ہیں اور پھر جس طرح تعلیمی اداروں کو سیاست بازی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے حکومت بھی اس سے بے خبر نہیں۔ اس لئے اگر حکومت اس صورت حالات کو ختم کر کے تعلیمی اداروں کے ماحول کو پرسکون بنانا چاہتی ہے تو وہ عربی زبان کو اس کا چھینا ہوا مقام دوبارہ عطا کر دے۔ اور وہ یوں کہ اسلامیات کی تعلیم کے لئے عربی زبان کو لازمی قرار دیا جائے۔ میری مراد یہ ہے کہ کالجوں یا یونیورسٹیوں میں جو طالب علم اسلامیات کا مضمون لیں ان کے لئے عربی زبان کا مضمون بھی اختیار کرنا لازمی ہو۔ اس بارے میں فوری فیصلے کی ضرورت ہے تاکہ آئندہ تعلیمی سال سے اس پر عمل کیا جا سکے۔ اس فیصلے کی رو سے یہ ضروری ہوگا کہ جو طالب علم گیارہویں جماعت میں اسلامیات کا مضمون اختیار کرے اس کے لئے عربی پڑھنا لازمی ہو۔ واضح رہے کہ اس مقصد کے لئے حکومت کو سرکاری خزانے سے ایک پیسہ بھی خرچ کرنا نہیں پڑے گا اور نہ ہی نصاب میں کوئی رد و بدل کرنا ہوگا اور دینی حلقوں کی طرف سے اس اقدام کو سراہا جائے گا۔ اس کے نتیجے میں تعلیمی اداروں سے سیاست کم ہونی شروع ہو جائے گی اور اس طرح تعلیمی اداروں کا ماحول بھی کسی قدر خوشگوار ہو جائے گا۔

لاہور میں
سپیئر پارٹس کی مشہور دوکان
سٹینڈرڈ آٹوموبائلز
پر تشریف لائیے
موٹر پارٹس - ٹرک (ڈیزل) پارٹس
ڈاج - بیڈفورڈ - لی لینڈ - بی ایل ایم سی
۱۴۸ - بادامی باغ لاہور ٹیلیفون 69012

ضرورت رشتہ
مڈل پاس امورِ خانگی و سلائی، کڑھائی کی ماہر اکیس سالہ دوشیزہ کے لئے قرآنی فکر سے متمسک رشتہ درکار ہے۔
(خط و کتابت بصیغۂ راز)
م ا ح - معرفت
ادارہ طلوع اسلام
۲۵ - بی - گلبرگ II لاہور

عربی خود سیکھئے کا چوتھا ایڈیشن چھپ کر آ گیا ہے۔ جلد منگا لیجئے۔
قیمت: -/۷ روپے (محصول ڈاک ایک روپیہ الگ)
ادارہ طلوع اسلام - ۲۵ - بی - گلبرگ II لاہور